اِنَّ ھٰذِہٖ تَذْکِرَۃٌ فَمَنْ شَاءَ اتَّخَذَ اِلٰی رَبِّہٖ سَبِیْلًا

رَشحاتُ الانس

موسوم بہ

لمحاتُ القدس

از

افادات مجمع البرکات عاشق ذوالجلال صاحبِ فضل ومال فقیر حق آگاہ

حضرت حاجی اوگھٹ شاہ وارثیؒ

متوطن بچھرایوں، ضلع مرادآباد۔انڈیا

PDF processed with CutePDF evaluation edition www.CutePDF.com

﴿جملہ حقوق بحقِ مؤلف محفوظ ہیں﴾

نام کتاب: ..... رشحات الانس موسوم بہ لمحات القدس

مصنف ومؤلف: ..... حضرت حاجی فقیر اوگھٹ شاہ وارثی

انگلش ترجمہ: ..... انجم سلطان شہباز

معاونت: ..... راشد عزیز وارثی

ٹائیٹل: ..... ایاز شہباز: الحجی پرنٹنگ پریس، جہلم

اشاعت باہتمام: ..... ربابہ ابرار یوسف وارثی

صفحات: 240

تعداد: 500

سنِ طباعت: ..... ستمبر 2009ء

ناشر: ..... مکتبۂ وارثیہ سنگھوئی، جہلم

﴿رابطہ برائے حصولِ کتاب﴾

۱۔ حاجی وارث علی شاہ مسولیم ٹرسٹ — دیوہ شریف (یوپی۔انڈیا)

۲۔ ٹرسٹ آستانہ عالیہ وارثیہ — چھپر شریف (ضلع راولپنڈی۔پاکستان)

۳۔ مکتبۂ وارثیہ — سنگھوئی، تحصیل وضلع جہلم (پاکستان)

۴۔ وارثی کتب خانہ — بورے والا۔ضلع وہاڑی (پاکستان)

حرفِ آغاز

؎ تیری نگاہ میں جو کچھ نہیں تو کیا ہوں میں
جہانِ عشق میں گو پیکرِ وفا ہوں میں

محبوب کی نگاہ میں جچنے کی خواہش انسان کو کیا سے کیا بنا دیتی ہے اور کہاں سے کہاں پہنچا دیتی ہے۔ محبّ حبیب کے اِک اِک اشارۂ ابرو پہ اپنا سب کچھ لٹا دینے کیلئے ہمہ وقت تیار رہوتے ہیں۔ ان کی زندگی کا مقصدِ وحید محبوب کی رضا ہوتا ہے۔ ان کے لبوں پہ ہر دم یہی ترانہ مچلتا ہے:

؎ میں ترے ہی در کا فقیر ہوں میں ترے ہی غم میں اسیر ہوں
مجھے اِک ذرا سی جگہ ملے تری چشمِ بندہ نواز میں

سرکار حضور عالم پناہ سیدنا حاجی وارث علی شاہ قدس سرہ العزیز عاشقِ ذاتِ الٰہ تھے۔ انہوں نے اپنے رب کے عشق میں، رب کی رضا کی خاطر اپنا سب کچھ لٹا دیا اور اس کی ذات میں ایسے محو ہوئے کہ اپنا آپ بھی بھول گئے۔ چنانچہ آپ اکثر فرماتے "سنا! سنا! ہم کچھ نہیں۔" رب کریم نے ان کے عشق کو امر کر دیا۔ اور ان سے فقر کے ایک ایسے سلسلہ کی ابتداء کر دی کہ جس کی بنیاد ہی عشقِ الٰہی پہ رکھی گئی۔ سرکار حضور وارثِ عالم نوازؒ نے فقر اور عشق کو لازم وملزوم قرار دیا۔ آپ فرماتے "فقیر عاشق ہوتا ہے۔" چنانچہ آپ سے تمام وارثی احرام پوش فقراء نے اسی عشق ومحبت کے سلسلہ کو آگے بڑھایا۔ انہیں فقراء میں سے عاشقِ ذوالجلال صاحبِ فضل وکمال فقیرِ بے مثال حضرت حاجی اوگھٹ شاہ وارثی اور فقیر

کامل واکمل عاشقِ وارثِ عالم نواز حاجی حافظ اکمل شاہ وارثیؒ بھی تھے۔جن سے سلسلہ وارثیہ کی بے پناہ ترویج واشاعت ہوئی۔انہیں کے دامن شفقت ومحبت میں پرورش پانے والی ایک عظیم شخصیت مفکر علم وعرفاں سالارِ قافلۂ سوز وگداز عکسِ جمالِ وارثِ عالم نواز حضرت الحاج فقیر عزت شاہ وارثیؒ ہیں۔عصرِ حاضر میں سلسلۂ وارثیہ کی ترویج و اشاعت کیلئے آپ کی خدمات بے نظیر و بے مثال ہیں۔مساجد،مدارس،مزارات اور فلاحی اداروں کے قیام کے ساتھ ساتھ آپ نے سلسلۂ وارثیہ کے لٹریچر کی اشاعت کی طرف خصوصی توجہ دی اور بے شمار قدیم اور نایاب کتب کی اشاعتِ نو کا بندوبست فرمایا۔

جون ۲۰۰۳ء میں آپ نے اپنے آخری سفر برطانیہ کے دوران حلقۂ محبین میں اس خواہش کا اظہار فرمایا کہ سلسلۂ وارثیہ کی ترویج واشاعت کیلئے قدیم اردو کتب کو انگلش زبان میں ترجمہ کر کے شائع کرانا چاہئے۔تا کہ انگریزی خواں طبقہ بھی سرکار وارث عالم نوازؒ کی تعلیمات سے مستفید ہو سکے۔اس وقت آپ کا روئے سخن برادرم یوسف وارثی صاحب کی طرف تھا۔انہوں نے حضرت صاحب سے اس سلسلہ میں تفصیل چاہی تو آپ نے ''حیاتِ وارثؒ'' از ''مرزا ابراہیم بیگ شیدا وارثی'' اور ''رشحات الانس'' از ''حضرت حاجی اوگھٹ شاہ وارثیؒ'' کے نام لئے۔چنانچہ جناب یوسف وارثی صاحب نے اپنے رہبر ورہنما کی اس بات کو پلے باندھ لیا اور اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کیلئے کمربستہ ہو گئے۔ان کے صاحبزادے راجہ ابرار یوسف اس سلسلہ میں ان سے بھی آگے بڑھ گئے اور ان دونوں کتابوں کی اشاعت کی تمام تر ذمہ داری اپنے سر لے لی۔ان کی کوششوں سے ''حیاتِ وارثؒ'' شائع ہو چکی اور اب ''رشحات الانس'' آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

حضرت الحاج فقیر عزت شاہ وارثیؒ نے اپنی زندگی میں کتنے کام شروع کئے۔کن کن لوگوں کو وہ کام سونپے،کن کن کے سپرد ذمہ داریاں فرمائیں اور کون کون سے لوگ ان ذمہ

داریوں کو نبھا رہے ہیں۔ یہ دردِ دل کے ساتھ سوچنے اور غور و فکر کرنے کا مقام ہے۔

یوسف وارثی اور ان کے صاحبزادے ابرار یوسف اس حوالے سے انتہائی خوش قسمت ہیں کہ انہوں نے اپنے شیخ کی زبانِ قدس سے نکلنے والے الفاظ کو سنا، سمجھا اور اسے عملی جامہ پہنایا۔ میری گزارش پر میرے انتہائی عزیز اور مہربان دوست جناب انجم سلطان شہباز نے بڑی محنت کے ساتھ اس کتاب کا انگلش ترجمہ کیا۔

اللہ کریم حضور سرورِ کائنات ﷺ اور سرکار وارثِ پاکؒ کے صدقے ان کی اس خدمت کو قبول فرمائے۔ انہیں دو جہان کی خوشیوں نعمتوں اور آسائشوں سے نوازے اور ہمیشہ کامیابیوں اور کامرانیوں سے سرفراز فرمائے۔ ان کے جذبۂ عشق و محبت اور سوز و گداز میں شب و روز اضافہ فرمائے اور ہم سب کو اپنے مرشدِ کریم کی تعلیمات کو سمجھنے، ان پر عمل کرنے اور دوسروں تک پہنچانے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین بحق سید المرسلین ﷺ۔

فقط

خاکِ درِ حبیب ﷺ

راشد عزیز وارثی

E-Mail: rawarsi707@yahoo.com

یاوارث

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِمَنْ قَدَّرَ خَیْراً وَّ جَمَالا وَالشُّکْرُ لِمَنْ صَوَّرَ حُسْناً وَّ جَمَالا

ثُمَّ اشْهَدُ بِاللّٰهِ هُوَالْوَاجِدُ حَقّاً ثُمَّ اشْهَدُ اِنْ قُدْرَۃِ لِلّٰهِ تَعَالٰی

اللہ اللہ کیا شان ہے کہ خالقِ کون ومکان کے ایک فرمان 'کن فیکون' نے یہ کرشمہ دکھایا کہ ہیچ دہ ہزار (ستر ہزار) عالم خلوت عدم سے جلوت وجود میں آیا۔ جو صانع ہے چون وچگوں کے انعاماتِ گوناگوں سے سراپا مملو ہے۔

تعالی اللہ کمال صنع بچون کہ ما را از عدم آورد بیرون

وجود جملہ ظلِ حضرت اوست ہمہ آثار صنع قدرت اوست

﴿اللہ تعالیٰ کی ذات کمال کی صانع ہے جس نے مجھے عدم سے باہر نکالا اور یہ تمام وجود اس کا سایہ ہے اور یہ تمام نشانیاں اس کی قدرت کی ہیں﴾

چنانچہ تمامی کائنات حضرت الوہیت کے کمالات کا مجموعہ اور سرکار احدیت کے صفات کا آئینہ ہے۔ ازعرش تا بہ فرش اس کی قدرت آشکار اور اس کی صنعت کا اظہار ہے بقول:

ہمہ اسما مظاہر ذاتند

ہمہ اشیاء مظاہر اسما

﴿تمام تر نام اس کی ذات کے ترجمان ہیں اور تمام چیزیں اس کے ناموں کی نشانیاں ہیں۔﴾

لیکن باوجود یکہ جملہ مخلوق اپنی سیرت میں فرد اور صورت میں بے نظیر ہے۔ مگر یہ مسلمہ ہے کہ انسان صنعت الٰہی کی مخصوص اور مکمل تصویر ہے بمصداق لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ اَحْسَنِ تَقْوِیْم ط جس طرح ذات ایزدی یکتا و بے ہمتا ہے اسی طرح یہ ہیکل انسانی اس کی قدرت کاملہ کی بے مثل نشانی اور تمامی مخلوق سے افضل وممتاز اور خطاب ''لَقَدْ کَرَّمْنَا بَنِی اٰدَمَ'' سے سرفراز ہے بقول جامی علیہ الرحمتہ

اے ذات تو از صفات ما پاک کنہ تو برون ز حد ادراک

آدم بتو شد مکرم ارنہ پیدا ست مقام ذرۂ خاک

﴿تیری ذات میری صفات سے پاک ہے اور تیری حدود میرے فہم ادراک کی حدوں سے باہر ہیں۔آدم کو تجھ سے تکریم ملی ورنہ خاک کا مقام ذرے سے زیادہ نہیں﴾

بلکہ خاص اسی مشت خاک کا یہ شرف واختصاص ہے کہ حضرت احدیت جل جلالہ نے اپنے یدقدرت سے خمیر کیا اور اس کی صنعت بے عدیل نے ایسا تشکیل وتجمیل مجسمہ تعمیر فرمایا جو بلحاظ آب وگل بظاہر تیرہ وتاریک ضرور ہے مگر درحقیقت انوار قدسیہ سے پرنور اور اسرار الٰہیہ سے معمور ہے۔بقول

زہے در تیرگی دیدار کردہ طلسم گنج پراسرار کردہ

حجاب صورت آنجا باز بستہ خودی و خویش درپردہ نشستہ

﴿اس نے اندھیرے میں دیدار بخشا اور مسحور کن خزانے کو اسرار سے لبریز کردیا وہاں اس نے اپنی صورت سے حجاب ہٹایا اور وہ خود اور اس کے اپنے پردے کے پیچھے بیٹھ گئے﴾

حتی کہ صانع باکمال نے ''وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِیْ ''کا مقدر اعزاز اور ''فِیْ اَنْفُسِكُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ''کا مخصوص امتیاز مرحمت فرما کر اس حسین مجسمہ کو تمام عالم وعالمیان سے ایسا برگزیدہ وممتاز کیا کہ معراج معرفت میں ''عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَاءَ كُلَّهَا'' کی دولت لازوال ودیعت ہوئی اور سرکار احدیت سے اس خاک کے پتلے نے خلیفۃ اللہ کا پاک اور مقدس خطاب پایا اور ذات واجب الوجود کا آئینہ اور اس کے صفات غیر محدود کا مظہر اتم ہوا۔بقول

خداوندے کہ جان بخشید وادراک نہاد اسرار خود را در کف خاک

زخاکے ایں ہمہ معنی نمودہ درو دیدار خود پیدا نمودہ

﴿اللہ تعالیٰ نے ادراک کو جان دی اور اسی مٹھی بھر خاک میں اپنے راز سمو دیے۔اسی خاک سے تمام معانی پیدا ہوئے اور اس میں اس نے اپنا جلوہ ظاہر کردیا۔﴾

حقیقت یہ ہے کہ وہ شاہد بے ہمتا جو پردۂ عظمت اور حجاب خفا میں بلحاظ یکتائی ہمیشہ سے مستور تھا۔اس نے باوجود بے نام ونشاں ہونے کے یہ شان دکھائی کہ صورت آدم میں جلوہ نمائی فرمائی۔بقول

اے مغربی آں یارکہ بے نام ونشاں بود

بے نام ونشاں آمدوبانام ونشاں شد

﴿اے مغربی وہ دوست جو کہ بے نام ونشاں تھا بے نام ونشاں آیا اور نام ونشان بن گیا﴾

یعنی اس لا۔مکان کی پیرنگی کا اظہار اس رنگ میں ہوا کہ

نخل قدش کہ از چمن جان برآمدہ
شاخ گلے بصورت انسان برآمدہ

﴿جب اس کے قد وقامت کا درخت باغ سے باہر آیا تو اس کی شاخوں پر انسان پھولوں کی طرح ظاہر ہوئے۔﴾

لہٰذا ان ہی مخصوص صفات کے لحاظ سے آدم باعتبار دیگر ممکنات کے اکمل وافضل ہے۔ جس کے شرف واقتدار کا اعلان بروز میثاق ہوا کہ جناب احدیت جل جلالہ نے اپنی مقرب ونورانی مخلوق سے حکم فرمایا کہ ''قُلْنَا لِلْمَلٰئِکَۃِ اسْجُدُوا''

آن دم کہ آدم آمد گردید آشکارا
اسرار کنت کنزاً کالشمس وانہارا

﴿اس وقت جب آدم کا ظہور ہوا تو آفتاب نے کن کے اسرار سمجھ کر روز وشب کا سلسلہ شروع کیا۔﴾

اگر یہ وجود خاکی رموز حقیقت کا آئینہ اور علم معرفت کا گنجینہ نہ ہوتا تو اس کے آگے مخلوق قدسی سرشت سر تسلیم خم نہ کرتی اور ابوالبشر آدم علیہ السلام مسجود ملائک نہ ہوتے بقول حضرت فریدالدین عطار علیہ الرحمۃ:

گر نہ بودے ذات حق اندر وجود
آب و گل را کے ملک کردے سجود

﴿اگر اس خاکی وجود میں اللہ کی ذات نہ ہوتی تو کبھی فرشتی اور پانی اور مٹی کے ان عناصر کے سامنے سجدہ ریز نہ ہوتے۔﴾

غرض انسان ہر چند خلقتاً ضعیف البیان ضرور ہے مگر بہ کمال تحمل واستقلال اس سرفروش نے وصال شاہد حقیقی کے جوش میں ناقابل برداشت بار امانت اٹھایا۔ جس کے صلہ میں سرکار کریم کارساز سے یہ اعزاز ملا کہ اپنے عاشق جانباز کو جملہ مخلوق سے ممتاز فرمایا بقول:

کرو فر ایزدی ہیئت آدم گرفت
رحمت پروردگار صورت انسان رسید

﴿اللہ تعالیٰ کا جلال وجمال انسان کی شکل میں آیا اور اللہ کی رحمت نے انسان کی شکل اختیار کرلی۔﴾

چنانچہ کتب سیر کی ورق گردانی کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ از آدم تا ایندم کوئی قرن ایسا نہیں گزرا کہ کسی فرد بنی آدم کی مخصوص شخصیت کا شہرہ نہ ہوا ہو اور اس کے علوی مرتبت کا نقارہ نہ بجا ہو۔ بلکہ ہر عہد میں خصوصیت کے ساتھ انسان کی شان وعظمت کا نشان بلند رہا۔ جس کی وجہ یہی ہے کہ درحقیقت انسان جامع کمالات ہے۔ جب تک حجاب تعینات میں محجوب ہے۔ مجبور ہے اور جب توفیق الٰہی سے اپنی اصل کی جانب رجوع ہوتا ہے تو آبائی شرف واختصاص کا حقیقی ورثا اس کو ملتا ہے۔

بلکہ ایسے انسان کامل کا عہد زندگی دنیا میں غیر معمولی طور پر یادگار ہوتا ہے اور اس کی قوم فخر ومباہات کے ساتھ اس کے فضل واقتدار کا اقرار کرتی ہے اور اس کی گرویدہ ہو کر اس کی تقلید میں سرگرم رہتی ہے اور اس کے افعال واقوال قلمبند کرتی ہے جس کے مطالعہ سے دوسروں کو ہمیشہ فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ بلکہ بعض مقدس حضرات نے اپنے سوانحات نہایت تصریح وتشریح سے تسطیر فرمائے ہیں اور وہی ذریں ہدایات کا مجموعہ سالکین راہ طریقت کے لئے مکمل دستورالعمل اور حصول فیضان باطنی کا مفید ذریعہ بنا ہے جس کی نسبت حافظ شیراز علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں:۔

کلک تبارک اللہ در ملک و دین کشادہ
صد چشمۂ آب حیوان از قطرہ سیاہی

﴿تیرا قلم اللہ تعالیٰ کی عنایت سے ملک اور مذہب میں متحرک ہے اور اس سے ٹپکنے والی سیاہی کے ایک قطرے سے آب حیات کے سو چشمے پھوٹتے ہیں۔﴾

مگر یہ خصوصیت انہیں برگزیدہ ہستیوں کے تذکروں میں ہے جن کو تقرب الٰہی کا شرف اور حیات جاوید حاصل ہے اور جو واقعی انسان بلکہ انسان کامل ہیں۔ اسلئے کہ ان کا عہد ظاہری جس طرح خلق کو فائدہ پہنچاتا ہے اسی طرح ان کا باطنی تصرف بھی سائر ودائر ہے اور رہے گا۔ کیوں کہ بقائے ایزدی نے ان کو حیات سرمدی مرحمت فرمائی ہے۔ بقول حضرت جامی علیہ الرحمۃ

زندۂ عشق نہ مُردست و نمیرد ہرگز
لایزالی بود این زندگی و لم یزلی

﴿جو عشق میں زندہ ہو کبھی نہیں مرتا اور نہ مردہ ہوتا ہے وہ اس زندگی میں لازوال ہوتا اور اس کے بعد بھی زوال میں نہیں گھرتا۔﴾

انھی حضرات کے حالت وواقعات قابل تحریر بھی ہیں اوران کے اقوال وافعال میں یہ تاثیر بھی ہوتی ہے کہ صدیوں کے بعدان کے مطالعہ سے ناظرین کامیاب اور فائز المرام ہوتے ہیں لیکن ماوشما کے سوانحات نہ اس لائق ہیں کہ تحریر میں لائے جائیں اور نہ ان کا مطالعہ آئندہ نسلوں کومفیداورسودمند ہوسکتا ہے۔

چنانچہ اکثراحباب نے اس فقیر سے فرمایا کہ تم اپنے حالات زندگی قلمبند کرو۔ جوہماری واقفیت کیلئے مفیداور بکارآمدہوں گے۔لیکن میں نے ہمیشہ یہی عرض کیا کہ فقرائے کاملین کے تذکرے مفیدضرورہوتے ہیں۔مگروہی حضرات جوصاحب خیروبرکات ہیں ان کے اقوال وافعال چونکہ حقانیت سے مملوہوتے ہیں اس لئے ان مقدس ہستیوں کے حالات وواقعات میں بھی یہ اثرمضمر ہوتا ہے کہ ان کے مطالعہ سے ناظرین کے حالات شائستہ اور خیالات پختہ ہوجاتے ہیں لہٰذا یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ بزرگوں کے تذکرے بھی فیض وتصرف سے خالی نہیں ہوتے لیکن میرے حالات نہ قابل ذکر ہیں نہ لائق التفات۔''من آنم کہ من دانم'' کا مضمون ہے جب کہ میری اس ہستی سے کسی کوفائدہ نہیں پہنچا تومیرا تذکرہ کب سودمند ہوگا۔

لیکن جب احباب نے باربار یہی اصرارکیا تومجبوراً مجھ کو یہ خیال ہوا کہ میرے حالات تودرحقیقت معمولی واقعات ہیں جوہرگز اس لائق نہیں کہ نذرناظرین کروں۔البتہ میری زندگی کا وہ حصہ جوپیشوائے برحق کے حضور میں گذرا ہے وہ اس وجہ سے قابل ذکرضرور ہے کہ ایسے ہادی کامل کا فقیراورایسے زبردست رہنما کا دست گرفتہ ہوں جس کی عظمت ورفعت کا شہرہ چاردانگ عالم میں ہے۔اگراس سلسلہ میں اپنی بیعت وارادت اوراپنی تہبند پوشی کا ذکرکروں توشاید زیادہ مناسب ہوگا۔کیوں کہ درحقیقت وہ ذکرسیدی ومولائی مرشدی وآقائے سرکارعالم پناہ آیۃ من آیات اللہ حضرت وارث پاک خلف الصدق صاحب لولاک کے فیضان وتصرف کا ذکرہوگا۔لہٰذا بقول مولانا علیہ الرحمۃ:

خوشتر آن باشد کہ سر دلبراں
گفتہ آید در حدیث دیگراں

﴿وہ نہایت خوش قسمت ہے کہ جس کا ذکرمحبوب کی محفل میں دوسروں کی باتوں کے دوران ہوتا ہے۔﴾

لہٰذااس پردہ میں اپنی حقیقی زندگی کے حالات یعنی وہ واقعات جوبارگاہ وارثی میں حاضری کے وقت دیکھے ہیں نگارش کروں گا لیکن محض سلسلہ کی غرض سے۔ پہلے اپنی ابتدائی

کیفیت اور آبائی حالت مختصر لفظوں میں عرض کرتا ہوں۔

ع: ''آں کس کہ گفت قصہ ما ہم زما شنید''

﴿وہ شخص کہ جس نے میرا قصہ میری زبان سے سنا﴾

ہر چند فقیر کا آج کوئی مملوکہ مکان کہیں نہیں لیکن اس قدر کہہ سکتا ہوں کہ قصبہ بچھرایوں ضلع مرادآباد کا قدیم رہنے والا ہوں اور آج بھی اس قصبہ میں جب آتا ہوں تو والد ماجد کا مزار چونکہ مسجد سہراب شاہ میں ہے اس لحاظ سے حسب ہدایت پیشوائے برحق وہیں قیام کرتا ہوں۔

پہلے میرا آبائی نام بدرالدین تھا۔ میری پیدائش ۸ محرم الحرام ۱۲۹۱ ہجری میں ہوئی اور والد بزرگوار کا اسم گرامی شاہ شمس الدین قادری چشتی صابری علیہ الرحمۃ ہے جو ابتدا میں زمیندار و ملازمت پیشہ تھے لیکن بعدہٗ جناب حاجی غلام رسول صاحب قادری قدس سرہٗ مسند آرائے گودہنا ضلع بلند شہر کے مرید ہوئے اور شاہ صاحب موصوف نے سیاحت کا حکم فرمایا تو مسلسل بارہ سال تک سیر و سیاحت میں مصروف رہے اور ہر طریق و شرب کے مشاہیر حضرات کی صحبت سے مستفیض ہوئے۔ بلکہ بعض فقرائے ہند کے ساتھ بھی رہنے کا اتفاق ہوا جیسا کہ آزاد خیال حضرات کا مذاق ہوتا ہے۔ بقول:

تلسی جگ میں آئے کے سب سے ملئی دہائے

نا جانے کہہ بھیس میں نارائن مل جائے

چنانچہ فقرائے ہند کے ارتباط و اتحاد سے یہ فائدہ ہوا کہ قواعد یوگ اور ضوابط جوگ جو طے مراحل کے لئے ان کے شرب میں لازمی ہیں ان سے کماحقہٗ واقفیت ہوئی اور طبیعت کا یہ انداز ہوگیا کہ ہر طریق و مسلک کے فقیر سے بجز اتحاد کے اختلاف نہیں فرماتے تھے۔ بلکہ جملہ اہل ملل و مذاہب سے یکساں ملتے تھے حتیٰ کہ یار و اغیار کی بھی تفریق اخلاق میں نہ تھی۔

بعد مدت معینہ جب سیاحت سے واپس آئے تو جناب شاہ صاحب ممدوح الصدر نے رموز توحید تعلیم فرمائے اور خلافت نامہ دیگر طریق قادریہ میں جس کا سلسلہ قطب الاقطاب حضرت اخوند صاحب مخدوم الولایت سوات نیر سے ہے خلیفہ مجاز کیا اور یہ بھی فرمایا کہ پیران کلیر شریف میں جا کر حقیقت آگاہ جناب پیر علی شاہ صاحب چشتی کے دست حق پرست پر سلسلۂ صابریہ میں بیعت کرو۔

چنانچہ اسی وقت بمصداق

"بہ مے سجادہ رنگین کن گرت پیر مغاں گوید"

﴿اگر تمہیں پیر مغاں کہے تو اپنے سجادہ کو شراب سے رنگین کر دو۔﴾

پیران کلیر شریف کا سفر کیا اور حسب الحکم پیر علی شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔شاہ صاحب نے بکمال شفقت خاندان چشتیہ صابریہ میں داخل کیا اور بعد ہدایات ضروریہ شرف خلافت سے مشرف فرمایا اور اپنا شجرہ جس کا سلسلہ حق نیوش حضرت شاہ خاموش قدس سرہ العزیز سے ہے مرحمت فرما کر ارشاد ہوا کہ اجمیر شریف جاؤ۔

جناب والد ماجد نے اسی شب کو حالت جوش ووجد میں ایک غزل لکھی جس کا مطلع اولی یہ ہے:

کہوں کیا رتبہ اعلی علاؤالدین صابر کا
جسے دیکھو ہے متوالا علاؤالدین صابر کا

دوسرے روز اجمیر شریف کا سفر کیا اور حضرت غریب نوازؒ کے آستانہ اقدس پر حاضر ہو کر خانقاہ کے ایک حجرہ میں چلہ کش ہوئے۔

ہنوز آپ اجمیر شریف میں حاضر تھے کہ بچھرایوں میں یہ واقعہ پیش آیا کہ سقف مکان سے شارع عام کی جانب میں گر پڑا۔لیکن مجھ کو خوب یاد ہے کہ اس گرنے میں صاف طور پر یہ دیکھا کہ ایک زن مجذوبہ نے مجھ کو گود میں لے لیا۔چنانچہ باوجود ایسی بلند چھت سے اور پختہ سڑک پر اس طرح گرا کہ زندہ رہنا ناممکن تھا۔مگر پیران طریقت کے فیضان وبرکت سے میرے تمام اعضا زخم اور چوٹ سے بالکل محفوظ رہے۔ بقول حضرت مولانا علیہ الرحمۃ:

اولیا را ہست قدرت از الٰہ
تیر جستہ باز گرداند ز راہ

﴿ولیوں کو اللہ کی طرف سے قدرت حاصل ہوتی کہ وہ کمان سے نکلے ہوئے تیر کو واپس موڑ سکتے ہیں۔﴾

اس واقعہ کے پانچ روز کے بعد جناب والد ماجد اجمیر شریف سے بچھرایوں آئے اور فرمایا کہ خواجہ غریب نواز کے تصرف سے مجھ کو یہیں معلوم ہوا کہ بدرالدین کو ٹھے پر سے گرا ہے اور اسی وجہ سے بچھرایوں آنے کا حکم ہوا لیکن جب مجھ کو تندرست دیکھا تو خوش ہو کر سجدۂ شکر ادا کیا اور ہر وقت مجھ کو ساتھ رکھنے لگے۔

اسی زمانہ میں ایک درویش جن کا نام موہن شاہ تھا اور ایک مجذوبہ عورت مسمی بنوکا

بہت شہرہ تھا اور قصبہ کے باشندے ان کو اہل جذب اور صاحب باطن سمجھتے تھے اور یہ دونوں خدا شناس والد ماجد کے پاس زیادہ آتے تھے۔ چونکہ میری عمر بہت کم تھی اور ان کی خدمت میں اس قدر شوخ ہو گیا تھا کہ اکثر موہن شاہ کے کاندھے پر سوار ہو جاتا تھا۔ مگر وہ اپنے حلم اور محبت سے میری اس گستاخی کو بھی نظر انداز فرماتے تھے۔

مجھے یاد ہے کہ جب میں کوٹھے سے گرا تھا تو پارہ عم (۳۰) میں سورہ کافرون پڑھتا تھا لیکن قرآن مجید ختم کرنے کے بعد میں سرکاری مدرسہ میں داخل ہو پھر مدرسہ اشفاقیہ اور نیز دیگر مکتبوں میں تعلیم پائی اور میلاد خوانی کا شوق ہوا تو والد نے چودھری محمد احسن خان صاحب کے سپرد کیا۔ جن کی خوش بیانی آج تک مشہور ہے اور ورزش میں استاد بدھو آہن گر کا شاگرد کرا دیا۔

چوں کہ جناب والد نے پھر سیاحت نہیں فرمائی۔ اس لئے اکثر درویش آپ کی ملاقات کو پھر ایوں آیا کرتے تھے۔ بلکہ پنجاب سے ہندو فقیر بغرض استفاضہ و رفع شکوک جب آئے تو ان کا قیام مہادیو مندر میں ہوا۔ والد ماجد وہیں جا کر سیتل تالاب پر بیٹھتے تھے اور کسی سے اذکار و اشغال کا تذکرہ، کسی سے رموز توحید میں گفتگو ہوتی تھی اور کسی کو یوگ اور جوگ کے مخصوص قواعد و فوائد سے آگاہ فرماتے تھے اور چوں کہ میں ہر وقت ساتھ رہتا تھا اسلئے وہ یادگار صحبتیں یاد ہیں اور ان کا نقشہ آنکھوں کے سامنے رہتا ہے۔

ایک روز امراؤ سنگھ سب انسپکٹر پولیس اور منشی اسد خان صاحب انسپکٹر حلقہ جو والد صاحب کے معتقدین میں سے تھے آئے اس وقت میں بھی حاضر تھا والد ماجد نے ان دونوں کو بھی بعض نصیحتیں کیں اور اسی اثنا میں مجھ سے مخاطب ہو کر فرمایا سنو:۔

پیران سخن بہ تجربہ گفتند گفتمت
ہاں اے پسر کہ پیر شوی پندگوش کن

﴿سخن شناس بزرگ جو کچھ کہتے ہیں تجربہ کی بنیاد پر کہتے ہیں لہٰذا اے میرے بیٹے بوڑھا ہونے سے پہلے نصیحت پر دھیان کر۔﴾

بدرالدین! ہم تم کو بھی ایک نصیحت کرتے ہیں اور یہ دونوں صاحب اس کے شاہد رہیں گے کہ اگر ہماری ہدایت کی خلاف ورزی کرو گے تو میں ہمیشہ ناخوش رہوں گا۔ ہر چند اس کی امید نہیں کہ تم مجھ کو رنجیدہ کرو گے۔ بلکہ خدا نے توفیق دی تو ضرور میری اس نصیحت کو مانو گے۔ بقول حافظ شیراز علیہ الرحمۃ:

نصیحت گوش کن جانن کہ از جان دوست تر دارند

جواناں سعادتمند پند پیر دانا را

﴿نصیحت پر کان دھرو،فرمانبردار جوان بزرگوں کی نصیحت کو جان سے پیارا جانتے ہیں﴾

میں نے عرض کیا کہ فرمایئے۔انشاءاللہ آپ کے حکم کی ضرور تعمیل کروں گا۔ارشاد ہوا کہ تمہارے واسطے یہی مناسب اور مفید ہے کہ تم مناکحت نہ کرنا اور ہمیشہ مجرد اور آزاد رہنا۔میں نے شوخی سے عرض کیا کہ آپ نے کیوں شادی کی؟فرمایا کہ ہم نے اپنے باپ کے حکم کی تعمیل کی ہے اسی طرح تم اپنے باپ کی ہدایت پر عمل کرو۔انہوں نے شادی کرنے کی ممانعت نہیں کی بلکہ خود ہماری شادی کردی اور ہم تم کو نصیحت کرتے ہیں کہ شادی نہ کرنا۔میں نے سر تسلیم خم کیا اور دست بستہ ہو کر اقرار کیا کہ جو آپ نے فرمایا ہے وہی کروں گا۔

غرض ہمیشہ آپ کی توجہ میری تربیت کی جانب مبذول رہی۔معمولی باتیں بھی زرین نصیحتوں سے مملو ہوتی تھیں اور ہر وقت فقر وتصوف کے نکات بیان فرماتے تھے جن کے سمجھنے کیلئے اس وقت میری عمر اس قدر نہ تھی۔افسوس ہے کہ آپ کے خزینۂ صدر کے جواہر بے بہا کے حصول سے یہ بدنصیب محروم رہا کیونکہ میرے عنفوان شباب میں دفعتاً آپ کی طبیعت ناساز ہوئی اور بعد کو معلوم ہوا کہ یہ آخری بیماری تھی۔

چنانچہ پہلے پھریا یوں کے اطباء کا علاج ہوا مگر جب افاقہ نہ دیکھا تو آپ بغرض علاج امروہہ میں آئے اور مجھ کو ہمراہ لائے۔چند روز کے بعد میرے منجھلے بھائی ڈاکٹر قمرالدین بھی وہاں آگئے۔ہم دونوں تیمارداری میں مصروف تھے کہ ایک روز مجھ سے فرمایا کہ اب ہم اچھے ہیں تم قصبہ دیوہٰ شریف ضلع بارہ بنکی میں جاؤ اور جناب حاجی سید وارث علی شاہ صاحب کے مرید ہو جاؤ۔

ہر چند بجز تعمیل ارشاد کے عذر کرنا لازم نہ تھا مگر حالت چونکہ روز بروز متغیر ہو رہی تھی اس لئے مفارقت گوارا نہ ہوئی اور اضطراری عالم میں یہ عرض کیا کہ:

''جب تک آپ کو صحت کامل نہ ہو جائے گی میں آپ سے ایک دن کے لئے بھی علیٰحدہ نہ ہوں گا۔''

پھر آپ نے یہ اصرار فرمایا کہ:

''تم جاؤ ہم اچھے ہو جائیں گے اور یہ بھی بتائے دیتا ہوں کہ جناب حاجی صاحب قبلہ سیر وسیاحت میں رہتے ہیں اگر دیوہٰ شریف میں نہ ہوں تو دریافت کرنا اور جہاں قیام پذیر ہوں وہیں جا کر ان کے مرید اور انہی کے فقیر ہو جانا۔ان کا لباس رنگین احرام ہے اور شیرینی

میں لڈو اور خوشبو میں حنا کا عطر پسند ہے یہی ہدیۃً لے جانا۔"

میں نے پھر وہی عرض کیا کہ:

"چند روز میں آپ کو افاقہ ہو جائے گا۔ اس وقت انشاء اللہ میں جاؤں گا اور بہ سروچشم آپ کے حکم کی تعمیل کروں گا۔ اس کے بعد آپ خاموش ہو گئے۔"

جناب والد ماجد قبلہ کی یہ ہدایت جو میرے دین و دنیا کی سلامتی کے واسطے کافی اور میری زندگی کیلئے سرمایۂ ناز ہونے والی تھی جب ختم ہوئی تو چند گھنٹے کے بعد رشتۂ حیات قطع ہونے کے آثار نمایاں ہوئے۔ حتیٰ کہ اسی روز یعنی ۱۱ ذیقعدہ ۱۳۱۴ ہجری کو بعد ظہر قفس جسدی سے طائر روح پرفتوح نے پرواز کیا۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن.

قبل انتقال کے یہ بھی فرمایا تھا کہ بہتر یہ معلوم ہوتا ہے کہ میرے ہادی طریق چشتیہ کے مزار اقدس کے قریب جو محلہ بٹوالا (امروہہ) میں ہے میری قبر ہو اور اگر پچھرایوں لے جانا تو مسجد سہراب شاہ میں مجھ کو دفن کرنا۔

چنانچہ بھائی قمرالدین نے پچھرایوں لے جانا مناسب سمجھا اور فوراً ایک تانگہ کرایہ کیا اور امروہہ سے روانہ ہوئے۔ راستہ سے بعجلت تمام میں آگے بڑھا اور مکان پر جا کر خبر کی اور تجہیز و تکفین کا سامان کیا اور نصف شب کے قریب وہ جسم نورانی حسب ہدایت مسجد سہراب شاہ میں سپرد خاک کیا۔

جب ظل ہمایت پدری سر پر نہ رہا تو والدہ صاحبہ کے سایۂ عاطفت کو مغتنم جان کر ان کی خدمت گذاری میں ایسا مصروف ہوا کہ والد مرحوم کی آخری ہدایت کی بھی تعمیل نہ کر سکا اور دیوی شریف تک سفر کرنے کا موقع اس وجہ سے نہ ملا کہ والدہ کی طبیعت ناساز رہنے لگی اور اگر ان کے علاج سے کبھی تھوڑی فرصت ملی بھی تو ان کا ضعف دیکھ کر علیحدہ ہونا دل نے گوارا نہ کیا اور ان کا اضمحلال یوماً فیوماً ایسا بڑھتا گیا کہ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے بھی پانچ ماہ کے بعد ربیع الاول ۱۳۱۴ ہجری میں ہمیشہ کیلئے اس دار فانی کو چھوڑا اور ملک جاودانی کو رحلت فرمائی۔

بعد مراسم چہلم وغیرہ میں نے ایک شب کو یہ خواب دیکھا کہ کوئی شخص کہتا ہے کہ تمھارے والد زندہ ہو کر آ گئے اور تم کو بلاتے ہیں یہ خبر سن کر میں دوڑا۔ راستہ میں غیر معمولی ہجوم نظر آیا جب اس مجمع کے قریب پہنچا تو یہ دیکھا کہ ایک سانپ ہے جس کا سر اور دم زمین کے اندر اور بقیہ جسم باہر ہے اور لوگ اس کو نکالنا چاہتے ہیں مگر وہ نکلتا نہیں۔ میں نے بھی اس کے

نکالنے کی کوشش کی۔لیکن جب وہ نہیں نکلا تو کسی نے کہا کہ اس کو چاقو سے کاٹ دو۔ میں نے ایسا ہی کیا تو اس کے ٹکڑے بہ آسانی نکل آئے۔اس کو چھوڑ کر آگے چلا تو حاجی اشفاق حسین صاحب کو دیکھا کہ اپنے مکان میں حسب معمول چوکی پر بیٹھے قرآن مجید کی تلاوت میں مشغول ہیں۔چونکہ والد کے دیکھنے کا اشتیاق ایسا تھا کہ ماموں صاحب کے پاس بھی نہیں ٹھہرا اور قصبہ کے باہر شرقی وجنوبی سمت وہ تالاب جو گنڈہ کے نام سے مشہور ہے اس کے قریب جا کر نظر آیا کہ تالاب کی دوسری جانب ایک باغ میں والد تہبند باندھے بیٹھے ہیں اور کلمہ طیبہ کا ذکر بالجہر کر رہے ہیں۔ میں نے بہت کوشش کی۔مگر طغیانی کی وجہ سے تالاب کے پار نہ جا سکا۔مجبور ہو کر بآواز بلند عرض کیا کہ میں کس طرف سے حاضر ہوں جس کے جواب میں والد نے یہ فرمایا کہ پورب سے آؤ گے تو مجھ تک پہنچ جاؤ گے۔حسب ہدایت میں پورب کی جانب چلا تو ایک پشتہ نظر آیا۔اس پر چلنے کا قصد کیا تو بیدار ہو گیا۔

میں نے اس خواب کی تعبیر یہ سمجھی کہ جب تک پورب جا کر جناب حاجی صاحب قبلہ کا حلقہ بگوش نہ ہوں گا۔دنیا کے عمیق تالاب سے عبور دشوار بلکہ اس کی سعی وکوشش کرنا بھی بیکار ہے۔بقول

نہ شوی واقف یک نکتہ ز اسرار وجود
گر تو سرگشتہ شوی دائرہ امکان را

﴿اگر تو ممکنات میں بھٹکتا رہا تو اسرار وجود کے ایک نکتے سے بھی واقف نہیں ہو پائے گا۔﴾

اس روز سے فکر زیادہ ہوئی کہ جس طرح ممکن ہو جلد سے جلد یہ دولت سرمدی حاصل کروں لیکن سفر کے لئے خرچ نہ تھا۔اس لئے چند روز حاضری سے معذور رہا۔ہر چند ناداری کے باعث اس سفر کی اہمیت زیادہ معلوم ہوتی تھی۔ بلکہ اکثر مایوس بھی ہو جاتا تھا۔لیکن کوئی قوت پھر آمادہ کرتی تھی اور دل فسردہ بیساختہ کہتا تھا:

حافظا غم مخور کہ شاہد بخت
عاقبت برکشد ز چہرہ نقاب

﴿حافظ غم مت کھا کہ تمہاری قسمت یاوری کرے گی اور آخر کار وہ چہرے سے نقاب اتارے گا۔﴾

ناگاہ غیب سے یہ سامان ہوا کہ ایک ضعیفہ جو والد مرحوم کی مریدہ تھی وہ آئی اور پچاس روپیہ پیش کرنے کے بعد کہا کہ یہ میرے پیر کا حکم تھا جس کی میں نے تعمیل کی۔اب تم حاجی

صاحب قبلہ کی خدمت میں جاؤ۔

میں نے خیال کیا کہ اس سفر کے واسطے پچاس روپیہ زائد ہیں۔ اس لئے بمصداق: ''ہر چہ گیرید مختصر گیرید'' پچیس روپیہ اس عزیز کو واپس کئے اور بقیہ پچیس روپیہ لے کر شوق ارادت میں یہ شعر پڑھتا ہوا بچھرایوں سے روانہ ہوا:۔

جاتے ہیں اب تو کوئے بت لالہ فام کو
اپنا تو بس سلام ہے دارالسلام کو

لکھنو پہنچ کر میری یاد نے غلطی کی کہ بجائے بارہ بنکی کے فیض آباد کا ٹکٹ خرید لیا اور چھ بجے شام کو وہاں پہنچا۔ شب کو سرائے میں قیام کیا۔ صبح کو بھیارہ سے جناب حاجی صاحب قبلہ کا پتہ پوچھا تو اس نے کہا وہ میرے بھی پیر ہیں۔ آپ بہت آگے چلے آئے۔ وہ ضلع بارہ بنکی میں رہتے ہیں۔ میں اسی وقت فیض آباد سے بارہ بنکی واپس آیا یہاں یکہ بھی فوراً مل گیا جس نے آٹھ میل کا وہ راستہ تقریباً ایک گھنٹہ میں طے کیا اور ۲۸ ربیع الثانی ۱۳۱۴ ہجری عصر کے وقت یکہ والے نے یہ مژدہ سنایا کہ دیوئی شریف آ گیا۔ جب معلوم ہوا کہ منزل مقصود یہی ہے تو عرصہ سے جو دل شوق زیارت میں بے چین تھا دفعتاً مسرور ہو گیا اور وفور مسرت سے یہ کیفیت ہوئی کہ بیساختہ زبان سے نکلا:۔

این مقام خوش کہ می بخشد نسیم وصل یار
خیز وارحلّ فِیْھَا خَیْرَ اَرْبَابِ الْمَیَار

چونکہ میں ناواقف تھا اس لئے یکہ والے نے رہنمائی کی اور آبادی میں جب پہنچا تو ہر چند بعض مکان خام اور خس پوش بھی نظر آئے جن کے دروازوں پر مویشی بندھے تھے یا کاشتکاری کا سامان رکھا تھا لیکن اسی کے ساتھ ایسی عمارتیں بھی دیکھیں جن کی شان و رفعت زبان حال سے باہر تھی کہ ان کے مکین مقتدر اور خوشحال ہیں۔ خصوصاً بعض آثار مظہر تھے کہ یہ قصبہ بہت قدیم ہے اور کبھی اہل قصبہ ذی جاہ و اہل ثروت تھے جیسا کہ ایک بلند مقام پر اینٹوں کا ڈھیر اور شکستہ دیوار دیکھی جس کو یکہ والے سے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ یہ عہد شاہی میں قلعہ تھا اور اسی کے مقابل پختہ اور بہت وسیع سرائے کا نشان بھی نظر آیا۔ البتہ قصبہ کے باشندوں کو باہم گفتگو کرتے جو سنا تو روہیلکھنڈ کی زبان سے بہت فرق پایا۔ خصوصاً لہجہ میں بیس تفاوت تھا لیکن یہ کہوں گا کہ اودھ کی زبان نرم و شیریں، خوشگوار اور دل آویز ضرور ہے۔

الغرض تھوڑی دور چلنے کے بعد جب یہ سعادت نصیب ہوئی کہ سرکار عالم پناہ کے

درِدولت پر حاضر ہوا تو دیکھا کہ قدیم وضع کا ایک پختہ مکان ہے جس کی سادگی میں ایسا دلفریب حسن نظر آیا اور اس کی عظمت کا وہ اثر دل پر ہوا کہ بلحاظ شرب اگر یہ یہ کہوں تو بے جا نہ ہوگا۔

کاخیست سر خاک بنا گشتہ و در قدر
بر کنگرہ چرخ کلاہ سرمہ شد

﴿یہ محل زمین پر بنا ہے مگر اس کی بلندی آسمان کے کنگروں کو چھوتی ہے۔﴾

سامنے جا کر یہ بھی دیکھا کہ اس آستانہ وارثی کا باب صدر مشرقی سمت متوسط پیمانہ کا مگر امتیازی شان رکھتا ہے اور اس کے آگے وسیع صحن ہے جس میں دروازہ کے شمالی پہلو کے قریب چاہ پختہ اور جنوب کی طرف کمرہ جس کے آگے سائبان اور اوپر بالاخانہ ہے اور اگر بعض اشخاص اس کمرہ میں بیٹھتے ہیں تو بعض کسی ضرورت سے یا بخیال تفنن طبع صحن میں کھڑے ہیں جن میں دو تین آدمی تو خدمتی معلوم ہوتے تھے اور کچھ لوگ دیہاتی طرز کی دھوتی باندھے اور کرتہ پہنے تھے جو شاید کاشتکار یا زمیندار ہوں گے اور چند اشخاص کے مہذب لباس سے ظاہر ہوتا تھا کہ یہ معزز و ممتاز افراد ہیں لیکن ان میں بھی یہ تفریق ضرور تھی کہ قدیم وضع کا لباس یعنی انگرکھا اور پائجامہ اگر کسی کے زیب جسم تھا تو بعض شیروانی اور ترکی ٹوپی پہنے تھے جن کی وضع یہ کہتی تھی کہ یہ مغربی تہذیب سے آگاہ ہیں اور مختلف مقامات کے باشندے ہیں۔

مجھ کو زیادہ حیرت اس وقت ہوئی کہ اس مجمع کے بعض بزرگ صورت حضرات کا لباس اپنی وضع میں بالکل جداگانہ دیکھا کہ انھوں نے ایک عریض اور رنگین کپڑے کے نصف حصہ سے ستر پوشی کی تھی اور نصف حصہ اس کا بطور چادر کے اوڑھے تھے اور ننگے سر اور پابرہنہ ہونے کی وجہ سے وہ دیندار سراپا آزاد اور تعلقات دنیا سے بے سروکار معلوم ہوتے تھے۔ میں نے ان بزرگوں کے مقدس لباس اور مخصوص امتیاز سے یہ اندازہ کیا کہ شاید حاجی صاحب قبلہ کے یہ فقیر ہیں۔

غرض میری ناواقفیت گو اجازت نہیں دیتی تھی مگر ٹھٹکتا ہوا جب قریب دروازہ کے پہنچا تو جو لوگ وہاں موجود تھے وہ میری اجنبی صورت اور میرا مسافرانہ اسباب دیکھ کر میری جانب مخاطب ہوئے۔ میں نے سلام کیا تو نہایت اخلاق سے انھوں نے سلام کا جواب دیا اور محبت آمیز لہجہ میں میری حاضری کا سبب دریافت کیا۔ میں نے عجلت میں اسی قدر کہا کہ قدم بوسی کو آیا ہوں۔

چنانچہ میری خواہش معلوم ہونے کے بعد ایک صاحب اس دروازہ کے اندر گئے اور چند منٹ میں واپس آ کر مجھ سے کہا کہ چلوتم کو بلایا ہے۔ اس مختصر جملہ سے کہ ''چلوتم کو بلایا

ہے'' ایسی مسرت ہوئی کہ بے اختیار دل نے لبیک کہا اور یقین ہوگیا کہ میری دیرینہ آرزو آج پوری ہو کر رہے گی۔

جب ان کے ہمراہ چلا تو صدر دروازہ کے پہلے ایک ایسی مسقف ڈیوڑھی میں داخل ہوا جس میں ایک دروازہ درمیانی اور ایک آخر میں تھا۔ اس کے اندر گیا تو دیکھا کہ کشادہ صحن کے جنوبی سمت کمرہ اور اس کے آگے خشتی در کا دالان ہے جس میں زمین کے فرش پر نہایت سادہ مگر امتیازی طور پر ایک گدا بچھا ہے جس پر ایک مقدس بزرگ رنگین احرام باندھے رونق افروز ہیں جن کا نورانی چہرہ اور پر سطوت آنکھیں دیکھ کر خود بخود دل کو یقین ہوگیا کہ

''خدا نما ہے خدا کی قسم یہی صورت''

ہر چند رعب عظمت سے دل مرعوب تھا مگر کشش حسن کا وہ گہرا اثر ہوا کہ پروانہ وار اس شمع جمال ایزدی کے قریب جا کر بہ کمال ادب قدمبوس ہوا۔ فرمایا: ''کہاں سے آئے ہو؟''

میں نے دست بستہ عرض کیا کہ بچھرایوں ضلع مرادآباد سے۔

ارشاد ہوا: ''ہاں بچھرایوں امروہہ سے دس کوس اور سنبھل سے بیس کوس ہے۔''

میں نے عرض کیا کہ جی ہاں اسی قدر ہے۔

پھر حضور نے ایک ضعیف تہبند پوش خادم سے مخاطب ہو کر فرمایا: ''رحیم شاہ! اس بستی کے رہنے والے کسی سے نہیں ڈرتے'' اور مجھ سے ارشاد ہوا۔ ''اچھا ٹھہرو۔ پھر ملاقات ہوگی'' اور دوسرے خادم سے یہ فرمایا کہ ''فیضو شاہ ان کو درگاہ میں ٹھہرا دو۔''

فیضو شاہ دالان سے باہر میرے ساتھ اس مقام تک آئے جہاں اپنا اسباب چھوڑ گیا تھا میں نے اس میں سے شیرینی اور عطر نکالا جو حسب ہدایت والد مرحوم لے گیا تھا اور وہ ناچیز ہدیہ حضور کے سامنے پیش کیا۔ جناب حضرت نے اس میں سے نصف لڈو تناول فرمایا اور اپنا اُلش نصف لڈو مجھ کو مرحمت ہوا اور بقیہ حاضرین کو تقسیم کر دیئے گئے۔

پھر فیضو شاہ صاحب مجھ کو اس مکان میں لائے جو درگاہ کے نام سے موسوم اور آستانہ وارثی سے تقریباً سو گز کے فاصلہ پر تھا۔ یہ درحقیقت ایک خانقاہ تھی اور درگاہ کے نام سے اس لئے مشہور ہے کہ شاہ ولایت حضرت محمد عبدالمنعم قادری گنج المعرفت قدس اللہ سرہٗ العزیز کا یہاں مزار اقدس ہے جس کے سجادہ نشین اس وقت شاہ فضل حسین صاحب تھے جن کو علاوہ اس شرف کے جناب حاجی صاحب قبلہ کی غلامی اور خدمت کا مخصوص اعزاز بھی حاصل تھا۔

درگاہ میں اسباب رکھ چکا تو اس وقت فیضو شاہ صاحب سے اپنی دلی تمنا کا اظہار کیا

کہ حلقہ غلامان وارثی میں داخل ہونا چاہتا ہوں۔ فیضو شاہ صاحب پھر مجھ کو آستانہ وارثی پر واپس لائے اور جب دالان کے قریب پہنچا تو سنا کہ سرکار عالم پناہ نے ایک خادم سے (جن کا نام بعد کو معلوم ہوا کہ قاضی بخشش علی تھا) فرمایا کہ "یہ خانصاحب پچھرایوں سے مرید ہونے آئے ہیں۔"

قاضی صاحب نے مجھ کو دیکھ کر عرض کیا کہ لیجیے وہ خود آ گئے اور ادھر فیضو شاہ نے دیہاتی لہجہ میں عرض کیا "حجور یہ مرید ہونے کو کہت ہیں"۔ اس رہنمائے کامل نے یہ بندہ نوازی فرمائی کہ اسی وقت میری دستگیری کی اور ارشاد ہوا:

"کہو ہاتھ پکڑتا ہوں پیر کا، پنجتن پاک کا، خدا رسول کا، اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ رَبِّیْ مِنْ کُلِّ ذَنْبٍ خَطِیْئَۃً وَّاَتُوْبُ اِلَیْہِ"

میں نے حرف بحرف ہر جملہ کا اعادہ کیا۔ بعدہ ارشاد ہوا: "جاؤ ٹھہرو۔ مرید ہو گئے۔"

میں قدمبوس ہو کر پھر درگاہ میں آیا اور اپنے بستر پر لیٹ رہا۔ مگر یہ تخیل ہوا کہ حسب ہدایت والد مرحوم مرید تو ہو گیا لیکن پیر صاحب شاید بیعت لینا نہیں جانتے کہ عام جلسہ میں مرید کیا۔ کیونکہ قبل اس کے دیگر بزرگوں کو خلوت میں مرید کرتے دیکھا تھا اور اسی کو میں صحیح طریقہ بیعت جانتا تھا۔

میں اس توہم میں مبتلا تھا کہ ناگاہ شاہ فضل حسین صاحب نے (جو روضۂ انور کے چبوترہ پر ایک مولوی صاحب سے باتیں کر رہے تھے) مجھ کو پکارا میں فوراً حاضر ہوا تو صاحب ممدوح نے ناصحانہ لہجہ میں فرمایا:

"خاں صاحب تم نے فقیر دیکھے نہیں ہیں۔ البتہ تمھارے والد جانتے تھے جو تم کو یہاں بھیج گئے۔ خانصاحب یہاں اصل فقیری ہے اور صحیح طریقہ بیعت بھی یہی ہے۔"

موصوف الصدر کی اس تقریر کا میرے دل پر گہرا اثر ہوا اور دفعتاً وہ خدشات باطلہ میرے قلب سے رفع ہو گئے اور اب یہ خیال ہوا کہ جب یہاں کے مرید کا یہ حال ہے کہ میرے خواطر پر مطلع ہو کر آن واحد میں تصفیہ باطنی کیا تو پیر کی کیا شان ہوگی اور اپنے غلاموں کی اصلاح وہ کس خوبی سے کرتے ہوں گے۔ واقعی فضل الٰہی شامل حال تھا کہ مجھ پُر گناہ کو ایسے حقائق آگاہ کی غلامی کا شرف حاصل ہوا۔ جو درحقیقت فقیر اکمل اور مرشد لاثانی ہے۔ بلکہ دم ہوا کہ جب میرے مافی الضمیر سے اسی طرح بلکہ اس سے بہت زیادہ خبردار ہیں تو

ع: اب منہ دکھانے کی کوئی صورت نہیں رہی

بلکہ مجھ کو متحیر دیکھ کر شاہ صاحب نے فرمایا کہ خان صاحب تم نے جو خواب دیکھا تھا

وہ سانپ یہی تمھارے خیالات ہیں اور چاقو ہماری یہ نصیحت ہے۔ یہ سن کر میرا خیال اور پختہ ہوگیا کہ لاریب یہ بڑی جگہ ہے اور اس بارگاہ عالی کے غلام ایسا بلند مرتبہ رکھتے ہیں کہ جب ارادت کا صرف خیال تھا۔ اس وقت سے یہ لوگ میرے مدد ومعاون ہیں لیکن افسوس میری نادانی کا یہ نتیجہ ہے کہ اس وہم باطل نے ایسا ذلیل کیا کہ جس کی تلافی اب ناممکن معلوم ہوتی ہے۔

چنانچہ خجالت سے سر جھکا لیا اور شاہ صاحب کے سامنے سے شرمندہ ہوکر اپنے بستر پر آیا۔ ہر چند شوق زیارت نے بار بار تحریک کی مگر وفور ندامت سے پیشوائے برحق کے حضور میں حاضر ہونے کی جرأت نہ ہوئی اور شام تک یہ حالت رہی کہ جب اپنا قصور یاد آیا تو مغموم ہوا اور ان کی کریمانہ بخشش کا خیال ہوا تو عفو تقصیر کی امید میں یہ عرض کرتا تھا:۔

اے شہنشاہ بلند اختر خدارا ہمتے
تا بوسم ہمچو گردون خاک ایوان شما

﴿اے عظیم شہنشاہ! خدا کیلئے مجھے ہمت دے تاکہ میں تمہاری دہلیز کی اس خاک کو بوسہ دے سکوں جو عظمت میں آسمان کی برابری کرتی ہے۔﴾

قریب مغرب پھر صاحب ممدوح الصدر نے فرمایا کہ خانصاحب تم سرکار میں کیوں نہیں گئے۔ میں نے عرض کیا کہ اپنے خیال فاسد کی وجہ سے خائف اور نادم ہوں اور اپنی مذموم غلطی کے باعث سمجھتا ہوں کہ اب اس پاک اور مقدس ذات کے سامنے جانے کے لائق نہیں رہا۔ شاہ صاحب نے فرمایا کہ خانصاحب مایوس نہ ہو۔ ہم لوگ ذرہ صفت اور وہ باعظمت اور آفتاب منزلت ہیں۔ ہم کو مثل تالاب کے سمجھو جو تھوڑے پانی میں ابل پڑتے ہیں۔ ان کو بحر ذخار پیدا کنار جانو۔ ہم خطا شعار ہمیشہ نافرمانی کرتے ہیں مگر وہ اپنی مہربانی سے درگزر فرماتے ہیں۔ تمھاری غلطی کا داغ تمھارے اس آب ندامت نے دھودیا۔ اب نہ ڈرو۔ جاؤ اور ضرور جاؤ اور مطمئن رہو۔ امید ہے کہ وہ بندہ نواز ضرور تمھارا قصور نظر انداز فرمائیں گے۔

مجھ کو اپنے شفیق ناصح کے اس ارشاد سے یہ ہمت بندھی کہ لرزاں وترساں آستانہ وارثی پر حاضر ہوا اور قصوروار غلام کی حیثیت سے قدمبوسی کی۔ اس وقت جناب حضرت نے یہ شان محبوبیت دکھائی کہ متبسم لبوں سے فرمایا ''صبح کو چلے جانا۔'' میں نے بکمال ادب یہ عرض کیا کہ ابھی جانے کو دل نہیں چاہتا آئندہ جو حکم ہو۔ حضور خاموش ہوگئے اور پھر پانچ روز تک آستانہ اقدس پر حاضر رہا۔

جب حضور نے رخصت فرمایا تو ارشاد ہوا کہ ''شوال میں شاہ ولایت کے عرس میں آنا'' چوں کہ اس عرصہ میں مجھ کو یہ معلوم ہو چکا تھا کہ میلہ کا تک جو سرکار عالم پناہ کے حکم سے قائم ہوا ہے اس کو صرف پندرہ روز باقی ہیں اور شوق کا تقاضا تھا کہ جلد حاضر ہوں۔ اس واسطے دست بستہ عرض کیا کہ حضور تمنا یہ ہے کہ اس غلام کو میلہ میں طلب فرمایئے۔ جناب حضرت نے شاید میری مالی حالت کے لحاظ سے پھر وہی فرمایا کہ ''شوال کے عرس میں آنا'' اور میری زبان سے اضطراری حالت میں پھر وہی نکل گیا کہ بندہ نواز اس غلام کو میلہ میں طلب فرمایئے۔ چنانچہ اس مرتبہ اس جامع حلم وکرم نے عجیب شان سے مسکرا کے یہ فرمایا کہ ''اچھا! جاؤ! ضرور میلہ میں آنا۔

میں قدمبوس ہو کر ۳ جمادی الاول کو بچھرایوں واپس آیا اور اسی روز سے دوسرے سفر کے لئے انتظام کرنے لگا۔ ہر وقت یہی خیال تھا کہ اس جمال جہاں آرا کی دید کب نصیب ہو۔ خصوصاً جب دو تین دن روانگی کے باقی رہے تو اضطراب کی یہ حالت تھی کہ ایک ساعت ایک دن اور ایک دن ایک سال معلوم ہونے لگا۔ بقول:

ماہم این ہفتہ شدازشہروبچشم سالیست
حال ہجران توچہ دانی کہ چہ مشکل حالیست

﴿مجھے اس کے شہر سے آئے ایک ہفتہ ہوا اور آنکھوں کو سال محسوس ہوا۔ اس ہجر کا حال تم کیا جانو گے کہ یہ کس قدر کٹھن ہوتا ہے۔﴾

آخر وہ دن بھی آ گیا کہ معمولی اسباب لیکر بچھرایوں سے روانہ ہوا اور ۱۴ جمادی الاولیٰ ۱۳۱۴ ہجری کو جو افتتاح میلہ کی تاریخ تھی دیوی شریف پہنچ گیا اور بعد حصول سعادت قدمبوسی مجھ کو حکم ہوا کہ ''درگاہ میں قیام کرو۔'' کیونکہ یہ امر خصوصیات عادات میں ہے کہ حضور نے وضعداری کا لحاظ ہمیشہ فرمایا جس کا ذکر آپ کے ملفوظات میں بوضاحت منقول ہے اور چونکہ مزاج ہمایوں کا انداز یہی تھا اس لئے غلاموں کو بھی متواتر وضعداری کی ہدایت ہوئی۔ بلکہ جس نے کسی امر میں اگر پابندی کی تو اس سے آپ خوش بھی ہوئے اور اس کو وضعدار کا خطاب بھی مرحمت ہوا اور خود تو وضعداری کو اس درجہ پسند فرمایا تھا کہ اگر کوئی معمولی بات بھی کبھی وقوع پذیر ہوئی تو اس کے لئے یہ اہتمام ہوتا کہ آئندہ جب اس کا موقع آیا تو اس کو اسی صورت سے کیا جاتا تھا جس شکل سے وہ ابتدا میں ہو چکی ہے مثلاً کسی شہر یا قصبے میں جس کے مکان پر آپ پہلی مرتبہ قیام پذیر ہوئے پھر ہمیشہ کے واسطے یہ دستور ہو گیا کہ جب وہاں تشریف لے گئے تو اس کے مہمان ہوئے۔ بلکہ دیہات کی سیاحت میں یہ دیکھا ہے کہ کسی درخت کے سایہ میں کبھی

قیام یا استنجہ کیا یا کسی کنویں کا پانی نوش فرمایا تو جب اس راستہ سے گذر ہوا تو اسی درخت کے سایہ میں ضرور ٹھہرے ۔یا استنجہ کیا۔یا اس کنویں کا پانی قلیل ہی سہی مگر نوش فرمانا لازمی تھا ۔یا جس کسی کے ساتھ جو مراعات ایک مرتبہ کی گئی وہ ہمیشہ اس موقع پر کی جاتی تھی ۔علیٰ ہذا آستانہ اقدس پر جو مہمان آیا اور جس کے قیام کے واسطے جو جگہ پہلی مرتبہ تجویز ہوتی تھی ۔پھر ہمیشہ اس مہمان کا قیام اسی مکان میں ہوتا تھا۔لہٰذا پہلی مرتبہ چونکہ میں درگاہ میں رہا تھا اس اعتبار سے میرا استحقاق ہو گیا کہ جب حاضر ہوں تو درگاہ میں رہوں ۔چنانچہ حسب الحکم درگاہ میں بستر لگایا اور دیکھا کہ بعض اخوان ملت مجھ سے پہلے آ چکے ہیں اور بعض میرے بعد آئے ۔حتیٰ کہ میلہ بھر گیا اور ہر طبقہ کے لوگ ۱۵ تاریخ تک جمع ہو گئے جن میں کاشتکار اور ادنیٰ درجہ کے زمیندار بھی تھے اور رئیس اور تعلقدار بھی ،فقیر و درویش بھی ، عالم و فاضل بھی ، وکیل و بیرسٹر بھی ، اہل عملہ بھی ، ڈپٹی اور سب جج بھی ۔غرض امیر و غریب بھی ۔ادنیٰ و اعلیٰ جوق در جوق اطراف و جوانب سے آئے اور آستانہ وارثی پر ان مختلف ذوق والوں کا ایک مقام پر اور باہمی اتحاد کے ساتھ بغیر کسی امتیاز کے یہ ایسا مخصوص مجمع تھا کہ رنگا رنگ پھولوں کا گلدستہ معلوم ہوتا تھا۔

قرینہ ہے کہ جس طرح اس مجمع کے ہر فرد کی ظاہری وجاہت اور حیثیت جداگانہ تھی اسی طرح ان کی واردات اور استعداد باطنی بھی ضرور مختلف ہوگی ۔لیکن تعجب یہ ہے کہ باوجود اس اختلاف طبائع کے ایک خیال میں یہ پورا مجمع ایسا متحد تھا جس کی نظیر ملنا دشوار بلکہ قریب محال کے ہے کہ ہر شخص دنیاوی اغراض سے قطعی محترز اور شمع جمال وارثی کا پروانہ تھا اور ہمہ تن کوشاں تھا کہ کوئی خدمت میں ایسی کروں جس سے حضور محظوظ ہوں ۔

چونکہ قبل اس کے میں نے دیکھا نہ تھا کہ کسی بزرگ کے جملہ مرید اس کے ایسے شیفتہ ہوں اور بغیر کسی غرض کے اس کی ایسی خدمت اور دلجوئی کریں کہ ان کی حیثیت سے بہت زیادہ ہو بلکہ سنا بھی نہ تھا کہ فلاں پیر کے تمامی حلقہ بگوش اس کے فریفتہ ہیں اور صرف خوشنودی مزاج سب کا نصب العین ہے اس واسطے غلامان وارثی کی یہ محویت دیکھ کر مجھ کو حیرت ہوئی اور اس نظارہ سے میرے فہم و ادراک میں اس قدر اہتزاز بھی ہوا کہ سکون قلب میں گونہ اشتعال اور طبیعت میں خود رفتگی کے آثار نمایاں ہونے لگے ۔مگر شوق میں یک سوئی ضرور پیدا ہو گئی کہ بجز جمال وارثی کوئی دوسری صورت تسکین بخش اور دل آویز نہ رہی ۔بقول:

بخت خواب آلود ما بیدار خواہد شد مگر
زانکہ زد بر دیدہ آبے روئے رخشانِ شما

﴿میرے سوئے ہو بھاگ جاگ اٹھے مگر اس طرح کہ میں نے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں آپ کے چہرے کی چمک دیکھی۔﴾

اور دل میں خواہش یہ پیدا ہوئی کہ اپنے یوسف جمال پیشوا کے جان نثار غلامان میں اگر میرا بھی شمار ہو جائے تو بیڑا پار ہے۔ ہر چند عاشقان سرفروش کی مثل بے خود و مدہوش ہو جاتا تو مجھ افسردہ دل کے لئے ناممکن ومحال ہے لیکن در دولت کا جاروب کش بھی ہو جاؤں تو یہ موقع ہاتھ آئے کہ خاک پائے محبوب کو کحل البصر بناؤں۔ بقول

گر دست دہد خاک کف پائے نگارم
بر لوح بصر خط غبارے بنگارم

﴿اگر مجھے ان کے پاؤں کی تھوڑی سی خاک میسر آ جائے تو میں اسے آنکھوں سے لگاؤں اور سرمے کی طرح دھار بنالوں۔﴾

اس اہتزاز کا ظاہری نتیجہ یہ ہوا کہ بعض حرکات خلاف عادت ایسے بھی سرزد ہوئے کہ جن کے وقوع سے خود مجھ کو شرم وندامت ہوتی تھی لیکن اسی کے ساتھ یہ کیفیت ہوگئی کہ جس چیز کو حضور کے ساتھ منسوب پایا اس سے دل بستگی ہوتی تھی۔ چنانچہ ۱۵ تاریخ کو میلہ دیکھنے شاہ ولیس گیا یہ مقام آستانہ وارثی سے قریب دو فرلانگ کے ہے۔ علاوہ دیگر تماشوں کے وہاں یہ کرشمہ بھی دیکھا کہ ایک ارادتمند حضور کی خدمت میں تہبند پیش کرنے جاتا ہے۔ مگر شان یہ ہے کہ باجہ اور قوالی کے علاوہ ہزاروں آدمیوں کا مجمع بھی ہمراہ ہے۔ چونکہ اس مجمع کو حضور سے خاص نسبت تھی لہٰذا مجھ کو بھی دلچسپ معلوم ہوا اور تہبند کے ساتھ جب قریب آستانہ اقدس پہنچا تو دفعتاً یہ ہوش آیا کہ تم سرفروش غلاموں کے دوش بدوش رہنے کے متمنی بھی ہو اور بلحاظ مشرب اس کا بھی دعویٰ ہے کہ۔

من قبلہ راست کردم بر سمت خوش ادائی
عریان سرے چو ماہ و شوخے برہنہ پائی

﴿میں نے محبوب کی طرف قبلہ درست کر لیا ہے اور میرا ننگا سر چاند کی طرح ہے اور میں ننگے پاؤں چلتا ہوں۔﴾

لیکن یہ نہیں سوچتا کہ ارض پاک پر جوتا پہن کر چلنا اور پیشوائے برحق کے حضور میں ٹوپی پہن کر جانا صریح بے ادبی اور بہت بڑا قصور ہے۔

چونکہ افضال وارثی شامل حال تھا۔ میرا یہ خیال پختہ ہوگیا اور اسی وقت جوتا بھی وہیں

چھوڑ دیا اور ٹوپی بھی پھینک دی اور اس مجمع کے ہمراہ سرکار عالم پناہ کے حضور میں حاضر ہوا اور جب وہ تہبند پیش ہو گیا تو میں اسی ہیئت کذائی سے درگاہ آیا۔ شاہ فضل حسین صاحب سے اپنی انتشاری کیفیت اور اضطراری حالت بیان کی کہ اب انتظار کی طاقت نہیں۔ دل بیقرار کا بار بار یہی اصرار ہے:

بزن بسنگ ملامت زجامہ ناموس
بکوی عشق بریز آب روی تقوی را

﴿اپنی عزت و ناموس کو ملامت کا پتھر مارو اور عشق کے کوچے میں اپنی پارسائی پانی کی طرح بہا دو۔﴾

لہٰذا حسب ہدایت والد مرحوم پہلے سے بھی مصمم ارادہ تھا۔ لیکن آج مستقل طور پر یہی تمنا ہے کہ سرکار عالم پناہ کا فقیر ہو جاؤں۔ گو عمر کے لحاظ سے مجھ کو تجربہ بہت کم ہے۔ مگر روزمرہ کے واقعات دیکھ کر کہ دنیا بے ثبات اور تعلقات دنیا بیکار بلکہ باعث آزار ہیں بقول

جہاں و کار جہاں جملہ ہیچ در ہیچ است
ہزار بار من ایں نکتہ کردہ ام تحقیق

﴿میں نے ہزار مرتبہ تحقیق کی ہے کہ دنیا اور اس کے کام بے معنی ہیں﴾

شاہ صاحب موصوف نے فرمایا کہ ہنوز عنفوان شباب ہے۔ تہبند پوش ہونے کا ارادہ نہ کرو لیکن جب میں نے اصرار کیا تو ممدوح نے رحیم شاہ صاحب کو بلا کر کہا کہ یہ تہبند کے طلبگار ہیں۔ وہ سرکار میں گئے اور واپس آ کر کہا کہ حضور فرماتے ہیں کہ ''ابھی نہیں یہ لڑکے ہیں۔''

یہ پنجشنبہ کا واقعہ ہے کہ میری درخواست بارگاہ وارثی میں نامنظور ہوئی تو مایوس ہوا لیکن اضطراب قلب سے تمام شب بیقرار رہا۔ کبھی والد مرحوم کی برزخ قائم ہو گئی تو ان سے عرض کیا کہ یہ عبد ذلیل ہنوز آپ کی ہدایت کی تعمیل نہ کر سکا۔ مجبور ہوں کہ سرکار عالم پناہ منظور نہیں فرماتے اور کبھی بکمال خضوع حضور اقدس سے رجوع کی۔

منتظر از ا بہ لب آمد نفس
اے ز فریاد تو فریاد رس

﴿میں سامنے منتظر ہوں اور میری جان لبوں پر ہے اے فریاد سننے والے میری فریاد سن﴾

بادشاہا! تو پنجتن پاک کا یادگار اور قائم مقام ہے اور وارث عالم تیرا نام ہے۔ تیرے

چشمہ فیض وانعام سے خاص وعام ہمیشہ فائز المرام ہوئے لیکن افسوس یہ غلام شومئی قسمت سے ہنوز محروم وناکام ہے بقول:

بست شکر بہ مستان داد و چشمت مئے بہ میخواران
منم کز غائیت حرمان نہ باآنم نہ باایں

﴿اس نے مستوں کو شیرینی عطا کی اور میخواروں کو آنکھوں سے پلادی مگر میں بدنصیب نہ اُن میں اور نہ ان میں﴾

حتیٰ کہ جمعہ کا دن اسی حالت میں گذرا کہ ننگے سر، پابرہنہ پریشان پھرتا رہا۔ مگر آٹھ بجے شب کو بخت خوابیدہ بیدار ہوا کہ رحیم شاہ صاحب آئے اور شاہ فضل حسین صاحب سے کہا کہ بھائی وہ خانصاب کہاں گئے۔ سرکار ان کو بلاتے ہیں۔ اس وقت میں جنوبی دالان میں کسی کتاب کا مطالعہ کررہا تھا کہ مژدہ سنکر مسرور ہوگیا اور دل میں کہا کہ بڑا خوش نصیب ہوں کہ میرے بندہ نواز نے مجھ کو یاد فرمایا۔ بقول:

شکر خدا کہ از مدد بخت کارساز
برحسب مدعاست ہمہ کاروبار دوست

﴿اللہ کا شکر ہے کہ اس کی مدد سے قسمت نے یاوری کی اور میرے دوست کے معاملات اس کی مرضی کے مطابق چل رہے ہیں۔﴾

اسی وقت شاہ فضل حسین صاحب نے مجھ کو بلا کر فرمایا کہ تہبند لیکر جاؤ۔ میں فوراً تہبند معہ لنگوٹ اور رومال کے لیکر بارگاہ وارثی میں حاضر ہوا۔ دیکھا کہ کمرہ میں حضور کے پاس رحیم شاہ، نور محمد شاہ، قاضی بخشش علی، اور بادشاہ حسین خان حاضر ہیں۔ میں نے تہبند پیش کیا جناب والا نے وہ تہبند زیب جسم فرمایا اور اپنا مستعمل تہبند ولنگوٹ مجھ کو مرحمت فرما کر ارشاد ہوا کہ ''باندھ لو'' اور نور محمد شاہ سے خطاب ہوا کہ ''ان کو لنگوٹ کی گرہ بتادو''۔ چنانچہ جس وقت وہ لنگوٹ اور تہبند باندھ کر قدمبوس ہوا تو ہیبت حق سے مجھ کو پسینہ آ گیا۔ حضور نے تبسم فرمایا اور ارشاد ہوا کہ ''بادشاہ حسین یہ فقیر کا بیٹا ہے۔ یہاں اگر نہ آتے تو قیامت میں کھنچے پھرتے۔ آج سے اس کا نام اوگھٹ شاہ ہے'' اور مجھ سے مخاطب ہو کر فرمایا۔ ''سوال نہ کرنا اور مونڈھے، کرسی، تخت اور پلنگ پر نہ بیٹھنا اور پچھرایوں میں اپنے باپ کی قبر پر رہنا اور کہیں نہ جانا۔ جب آؤ تو یہیں آؤ۔ کسی کے مکان پر ہمیشہ نہ رہنا''۔ پھر رحیم شاہ سے مخاطب ہو کر فرمایا: ''ان کو تعلیم کردو''۔ رحیم شاہ نے عرض کیا کہ میں اس لائق کہاں۔ تب حضور نے مجھ سے فرمایا: ''جاؤ تم کو تعلیم کی ضرورت نہیں۔ تم فقیر

کے بیٹے ہو اور اب ہمارے فقیر ہو گئے۔'' اور پھر اسی جملہ کو بادشاہ حسین خان سے بھی یوں فرمایا: ''یہ فقیر کے بیٹے ہیں اور اب یہاں فقیر ہو گئے۔ ان کو رموز فقر کی تعلیم ضروری نہیں۔ ان سے خطا ہی نہ ہوگی۔'' اور مجھ سے ارشاد ہوا: ''جاؤ محبت رکھنا وہاں تو بہت مرید ہیں'' میں قدمبوس ہو کر درگاہ میں آیا تو مجھے تہبند پوش دیکھ کر شاہ فضل حسین صاحب بہت خوش ہوئے۔

صبح کو حاضر ہوا تو عرض کیا کہ والد کی قبر ایک غیر آباد مسجد کے احاطہ میں ہے جس میں حجرہ بھی نہیں۔ سرکار عالم پناہ نے فرمایا: ''کہ کوئی رہے یا نہ رہے تم جا کر وہیں رہو اور وہی تمھارے لئے حجرہ ہے جس وقت حجرہ بن جائیگا، بن جائے گا۔ کوئی نہیں روک سکتا ہے'' اور بعد چند ساعت کے ارشاد ہوا: ''اب جاؤ۔ سیر کرو''۔

اس فرمان وارثی کے آخری حصہ کا مفہوم میں یہ سمجھا کہ سیر کرنے سے تماشا دیکھنا مقصود نہیں بلکہ مشاہدات خلق سے معلومات حاصل کرنا ہے چنانچہ اس روز میں نے یہی کام کیا کہ پہلے معمر فقرائے وارثی سے ملا اور گہری نظر سے ان کا طریق معاشرت دیکھا اور ان کے نصائح بگوش دل سنے اور ان سے سرکار عالم پناہ کے وہ حالات وواقعات معلوم ہوئے جو میرے واسطے مکمل دستور العمل کا حکم رکھتے تھے۔

علی ہذا ایسے اخوان ملت سے بھی ملاقات ہوئی جن کو قدامت کا شرف حاصل تھا اور حاضر باش تھے۔ ان سے آستانہ اقدس کے وہ قواعد معلوم ہوئے جن کی تعمیل حاضرین کو مفید اور لازمی تھی اور اوقات حاضری اور خدام خاص کے نام بھی انھوں نے ہی بتائے اور انھیں نے خوشنودی مزاج کے ظاہری طریقے سمجھائے اور وہ امور جو شرعی لحاظ سے ممنوع تھے ان سے بھی آگاہ کیا۔

غرض اس تبادلۂ خیالات سے مجھے کسی قدر شرعی معلومات بھی ہو گئیں اور اس کا اندازہ تو بخوبی ہو گیا کہ طریق وارثی عین عشق اور غلامان وارثی کا سرمایہ ناز صرف محبت ہے اور جملہ حلقہ بگوش بقدر حیثیت واستعداد محبت کا جوش ضرور رکھتے ہیں اور ان کی ترقی ان کے اخلاص پر منحصر ہے بلکہ ان کے ریاضات وعبادات بھی اصولاً محبت ہی سے ماخوذ ہیں۔

الغرض سترہ تاریخ کا پورا دن برادران طریقت کی ملاقات وصحبت میں گذرا۔ بعد مغرب دیکھا کہ بارگاہ وارثی میں غیر معمولی روشنی ہے اور مخصوص ارادتمند مجتمع ہیں۔ تھوڑے عرصہ میں حضور اپنے اسی بستر پر بیٹھ گئے اور آپ کے سامنے چند منٹ قوالی ہو کر حضرت سید قربان علی شاہ صاحب قدس سرہ العزیز کا قل ہوا اور مابعد آتشبازی چھوٹی جس کا مفہوم یہ تھا کہ میلہ ختم

ہوگیا۔

رات کو میں درگاہ میں آ کر سو رہا۔ صبح کو آستانہ اقدس پر حاضر ہوا تو دوسرا منظر تھا کہ کوئی اپنا اسباب باندھنے میں مصروف، کوئی سواری کیلئے کوشاں۔ غلامان وارثی اپنے آقائے ذی مرتبت سے رخصت ہوکر جوق درجوق آ رہے ہیں اور آپس میں مل کر ایک دوسرے کو الوداع کہہ رہے ہیں۔

حتیٰ کہ مجھ کو بھی نور محمد شاہ خادم خاص نے رخصت کرایا۔ اس وقت ارشاد ہوا۔ ''ان کو کھڑاؤں کیلئے دام دیدو۔ خادم نے چار آنہ مجھ کو دیے۔ پھر فرمایا کہ رومال کیلئے بھی پیسے دیدو'' چنانچہ چار آنہ رومال کے واسطے بھی پائے۔ پھر ارشاد ہوا: ''تمھارے مکان سے ریل کتنی دور ہے؟'' میں نے عرض کیا کہ بیس کوس اور اونٹ گاڑی سے جاتے ہیں فرمایا کہ ''اونٹ گاڑی کا کرایہ بھی ان کو دے دو۔'' غرض نو آنہ کرایہ گاڑی بھی مجھ کو مل گئے اور قدبوس ہوکر رخصت ہوا۔

مرادآباد میں آ کر رومال لے لیا اور کھڑاؤں بھی خرید کی لیکن کھانے کے واسطے ایک پیسہ بھی نہیں دیا گیا تھا۔ اس لئے تیسرا فاقہ تھا جب پھریاوں پہنچا اور بموجب ہدایت سیدھا مسجد سہراب شاہ میں گیا۔ یہ مسجد بستی کے باہر اور شکستہ ہونے کی وجہ سے غیر آباد تھی جس کے اُفتادہ حصار میں دروازہ بھی نہ تھا۔ صحن میں بکثرت گھاس اور خودرو درخت تھے اس خوف سے نہ کوئی اس میں نماز پڑھتا تھا، نہ اذان ہوتی تھی۔ مگر میں نے جا کر پہلا کام یہی کیا کہ اذان دی اور خس وخاشاک صاف کرنا شروع کردیا۔

یہاں ایک خدشہ یہ ہوسکتا ہے کہ ہمارے وارث دارین نے رومال اور کھڑاؤں کی خریداری اور اونٹ گاڑی کے کرایہ کے واسطے تو ایک روپیہ سے زیادہ مرحمت فرمایا لیکن خوردونوش جو انسان کی ضروری حاجت ہے۔ اس کے مصارف کیلئے ایک پیسہ بھی نہیں دیا۔ حالانکہ کھڑاؤں کا فوراً خرید کرنا چنداں ضروری نہیں معلوم ہوتا۔ کچھ روز ننگے پاؤں پھر سکتا تھا۔ علیٰ ہذا اونٹ گاڑی کا کرایہ، اس کی بھی ایک فقیر کے واسطے حاجت یوں نہ تھی کہ پیدل چلتا۔ جیسا بعد میں بارہا ہوا۔ خصوصاً رومال جس کا ہونا اور نہ ہونا مساوی ہے لیکن بایں ہمہ ان غیر ضروری چیزوں کا خیال تو اس اہتمام سے فرمایا۔ مگر کھانا جس کا انتظام لازمی تھا اور جس پر انسان کی زندگی کا دارومدار ہے اس اہم حاجت کا لحاظ نہ کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تین فاقہ راستہ میں اور چار فاقہ پھریاوں پہنچ کر مسلسل ہوئے۔ لہٰذا اگر یہ کہیں کہ سہواً ایسا ہوا تو ہمارے عقائد کے منافی ہے اور اگر عمداً کہا جائے تو باعتبار بشریت ہم دریافت کریں کہ اس میں کیا مصلحت تھی۔

میرا خیال یہ ہے کہ مصلحت وارثی سے کما حقہ آگاہ ہونا تو محال ہے لیکن بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے مشربی دستور العمل میں پہلی اور لازمی شرط توکل ہے اور ہر چند متوکل کے جملہ حاجات محول بخدا ہوتے ہیں۔ مگر نظر غائر سے دیکھا جائے تو حاجات کی بھی اقسام ہیں۔ بعض حاجتیں ایسی ہیں جن کی انسان کو ضرورت تو ہوتی ہے لیکن فوراً ان کا سامان فراہم نہ ہونے سے مضطر و بیقرار بھی نہیں ہوتا۔ البتہ رزق، حیات انسان کے واسطے ایسی مخصوص چیز ہے جس کی ہر بشر کو روزانہ حاجت ہوتی ہے اور یہ حاجت ایسی اہم اور خیالات کو منتشر اور متزلزل کرنے والی ہے کہ جس کی تلاش میں اکثر غیر خدا کی بھی استعانت چاہتا ہے اور پھر اس اضطرار سے زمرہ متوکلین میں اس کا شمار نہیں رہتا اور اگر فضل الٰہی شامل حال ہے کہ یہ حاجت پیش آنے پر پائے استقلال کو لغزش نہ ہوئی اور انسان صابر و قانع رہا تو وہی انسان درحقیقت انسان اور صاحب ایمان و ایقان ہے کیوں کہ حکم خداوندی "فتوکلوا ان کنتم مئومنین" کی وہ تعمیل کرتا ہے۔

اسی واسطے پیشوائے برحق نے اپنے فقرائے تہبند پوش کو اصل توکل کی متواتر ہدایت فرمائی ہے کہ اپنے پیٹ کے واسطے کوئی انتظام نہ کرو۔ قسمت رازق العبد پر راضی رہو۔ چنانچہ آپ کے ملفوظات میں ہے کہ فقرا کو حضور نے بصراحت اس کی ہدایت فرمائی کہ بے طلب دعوت کا کھانا کھایا کرو جس کا ذکر آئندہ بالتفصیل آئے گا۔

چنانچہ معلم حقیقی نے محض اپنی شفقت سے روز اول وہی سبق مجھ کو دیا جو کتاب العشق والمحبت کا پہلا باب ہے اور جس کو یاد رکھنا واجب اور تمام عمر جس کی تعمیل کرنا میرا فرض عین تھا۔ یعنی پیٹ بھرنے کے واسطے کبھی کوئی چیز خرید نہ کروں اور چونکہ قانون مشرب میں یہ شرط قطعی تھی تو ہادی کامل نے میرے واسطے اپنے اس حکم خاص کا عمل درآمد اسی روز سے مناسب تجویز فرمایا جب تہبند دیکر مجھ کو دیوبی شریف سے رخصت کیا۔

لہٰذا میں اپنے آقائے نامدار کے ہزار در ہزار احسانات میں سے پہلے اس احسان کا شکر ادا کرتا ہوں کہ ہادی کامل نے کیسے خوبصورت پیرایہ میں سمجھا دیا کہ خورد و نوش کا انتظام مشرب فقرائے تہبند پوش کے منافی ہے۔ چنانچہ میرے رازق حقیقی نے مجھ کو ہمیشہ دعوت کا کھانا کھلایا اور اتفاق سے اگر دعوت نہیں ہوئی تو فاقہ نصیب ہوا جو اس کے مطبخ قدرت میں بہت بڑی نعمت ہے اور الحمد اللہ کہ آج تک چولھا بنانے کی نوبت نہیں آئی اور اس کا بھی شکرگزار ہوں کہ پہلے میری دعوت اعزاء اور احباب نے نہیں کی بلکہ ایک غیر شخص کو اس کا خیال ہوا۔ باوجودکہ خاص عزیزوں کو میرا فقیر ہو کر آنا معلوم ہوا مگر کھانا مجھ کو ایک جولاہے نے کھلایا۔ اس سے یہ سبق

بھی حاصل ہوا کہ عزیزوں سے احانت کا خیال صریح دھوکا ہے۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ چار روز سے مسجد میں مقیم تھا اور اس دوران میں کسی سے ملاقات اس وجہ سے نہیں ہوئی کہ وہاں کوئی آتا تھا اور نہ میں مسجد سے باہر گیا۔ ساتواں فاقہ تھا کہ عصر کے وقت اذان کی آواز سن کر الہ بخش نور باف نماز پڑھنے آیا اور مجھ سے دریافت کیا کہ میاں صاحب آپ کا مکان کہاں ہے؟ میں نے کہا: ''پورب میں''۔ لیکن بعد نماز کے جب اس نے بغور دیکھا تو عذر خواہ ہوا اور فوراً جا کر ماموں اشفاق حسین صاحب سے میرا حال بیان کیا۔ ماموں صاحب نے میرے منجھلے بھائی ڈاکٹر قمر الدین کو بھیجا جس وقت وہ مسجد میں آئے، میں احاطہ کی گھاس صاف کر رہا تھا۔ بھائی صاحب نے کہا کہ یہ کیا صورت بنائی ہے۔ اگر ایسی فقیری کرنا ہے تو پھر ایوں سے نکل جاؤ۔ پہلے تو میں خاموش رہا۔ جب بہ اصرار جواب طلب کیا تو میں نے کہا کہ آپ تشریف لے جایئے۔ مجھے نہ عزت کا خیال ہے نہ ذلت کا ملال۔ بلکہ آپ سے بھی نہ کوئی واسطہ ہے نہ سروکار۔ الحمدللہ کہ قید تعلقات سے رستگار ہو کر اب ننگ وناموس سے کلیۃً دست بردار ہوں بقول:

ناموس چند سالہ اجداد نیک نام
در راہ جام و ساقی مہرو نہادہ ایم

﴿میں نے اپنے آباء کی نیک نامی جام اور خوبصورت ساقی کی نذر کر دی ہے۔﴾

بھائی صاحب نے فرمایا کہ تم کو شرم نہیں آتی۔ ماموں صاحب بلاتے ہیں گھر چلو۔ آرام سے رہو۔ اس ویران مسجد کا قیام باعث تکلیف بھی ہے اور نام بھی بدنام ہوگا۔ میں نے کہا کہ بھائی میرے واسطے شاہی سے بہتر اس کوچہ کی گدائی ہے جب تکلیف وراحت کا احساس نہیں تو پھر نہ آپ کی شخصیت کا پاس ہے اور نہ ماموں صاحب کی ثروت سے فائدہ اٹھانے کا ارادہ ہے۔ ہر چند کہ نہ مجھ کو فقر کا دعویٰ ہے، نہ متوکل ہونے کا مدعی ہوں۔ البتہ اس ہفتہ میں یہ انقلاب ضرور ہوا کہ پہلے بدرالدین نام تھا اور اب بارگاہ وارثی سے اوگھٹ شاہ خطاب ملا۔ لہٰذا معاف فرمایئے کہ ماموں صاحب کا بھروسا اس مقدس خرقہ کے خلاف ہے۔ بقول

گرچہ گرد آلود فقرم شرم باد از ہمتم
گر بآب چشمۂ خورشید دامن ترکنم
منکہ دارم از گدائے گنج سلطانی بدست
کے طمع درگردش گردون دون پردرکنم

﴿اگر چہ میرا گر دآلود فقر باعث ندامت ہے اور اس وجہ سے ہمت نہیں ہوتی کہ میں آفتاب کے چشمے سے اپنا دامن تر کرلوں۔ میں سلطانی خزانوں کا گداگر ہوں تو پھر حقیر دنیا کا لالچ کیوں کروں﴾

بھائی صاحب نے جب یہ بے التفاتی دیکھی تو مجبور ہو کر واپس گئے اور رات کو اسی نور باف نے میرے دعوت کی اور پھر یہ سلسلہ ایسا جاری ہوا کہ ہفتہ میں شاید دو روز فاقہ ہوتا ہو ورنہ پانچ روز ضرور دعوت ہونے لگی اور اس ویران مسجد میں رازق العباد نے میری پرورش کا یہ سامان کیا کہ لوگ میری تلاش میں آتے اور بہ اصرار تمام اپنے مکان پر لے جاتے اور کھانا کھلاتے۔ بقول

بے تگس ہرگز نماند عنکبوت
رزق را روزی رساں پر میدہد

﴿مکڑی مکھی سے کبھی خالی نہیں رہتی اس رازق حقیقی نے رزق کو پر لگا دیے ہیں﴾

لیکن جب سے میرا قیام مسجد میں ہوا اور پانچوں وقت اذان ہونے لگی اور وضو کیلئے پانی بھی بھر دیا کرتا تھا اور خس وخاشاک سے صحن اور احاطہ بھی پاک ہو گیا تو بعض وقت وہ جولاہے جو مسجد کے قریب رہتے تھے آنے لگے۔ مگر میں نے یہ روش اختیار کی کہ بستی میں کسی سے ملنے نہیں جاتا تھا۔ بلکہ زیادہ وقت مسجد کی خدمت یا احاطہ کی درستی میں صرف کرتا۔ اگر بہت دل گھبراتا تو جنگل کی طرف سے چھاندے پیر اور لطیف شاہ اور چھڑیا پیر کے مزار پر گیا۔ یا حضرت شاہ ولایت کے آستانہ پر حاضر ہوا اور پھر اسی طرف سے مسجد میں واپس آیا اور شب کو جنوبی در کے سامنے سو رہتا تھا۔

اسی طرح سے جب پانچ ماہ سے زیادہ گذر گئے اور حضرت شاہ ولایت کے عرس کا زمانہ قریب آیا تو میں نے بچھرایوں سے خدا کے بھروسہ پر پیدل سفر کیا۔ بقول

ہمتم بدرقۂ راہ کن اے طائر قدس
کہ دراز است رہ مقصد و من تو سفرم

﴿اے پاکیزہ پرندے ہمت کو اپنا زادراہ بنا لے کیونکہ تیری منزل دور ہے اور تو سفر میں ہے﴾

اور بعد قطع منازل ۱۴ شوال ۱۳۱۴ ہجری کو دیوئی شریف پہنچا۔ پہلے آستانہ وارثی پر حاضر ہو کر قدمبوس ہوا اور حسب دستور جناب حضور نے وہی فرمایا کہ درگاہ میں قیام کرو۔ چونکہ واقف ہو چکا تھا اس لئے بغیر کسی کی رہنمائی کے میں درگاہ میں آیا اور شاہ فضل حسین صاحب سے

ملا۔شاہ صاحب نے بکمال شفقت مجھ کو مہمان کیا۔

چونکہ شاہ صاحب رئیس اور قصبہ کے نمبردار تھے اور آبائی جائیداد وزمینداری آپ کے قبضہ میں تھی۔اس لحاظ سے موصوف ذی وجاہت اور سرآوردہ شخص تھے اور یوں تو عموماً ہر ایک کام شاندار ہوتا تھا لیکن عرس حضرت شاہ ولایت صاحب ہمیشہ آپ نے بہت کشادہ پیشانی سے کیا۔جس میں باورچی خانہ کا انتظام بہت وسیع پیمانہ پر ہوتا تھا۔علاوہ ان کے مہمانوں کے آستانہ وارثی کے بھی جملہ مہمان تا اختتام عرس انھیں کے مہمان ہوتے تھے۔قطع نظر اس کے رفاعی اور سہروردی آزاد فقراء کی کثیر جماعت آتی تھی جس کے ہر فرد کو حسب دستور دو وقت کھانے روزمرہ دیئے جاتے تھے اور جملہ دو کانداروں کو کھانا ملتا تھا اور بطور تبرک بستی کے تمام مسلمانوں کو کھچڑی تقسیم ہوتی تھی اور بعد پانچ روز کی مہمانداری کے ۱۶ تاریخ کو بھنڈارے کی ایک تقریب ایسی معین ہے جس کا صرفہ بھی کم نہیں۔ہر چند یہ بھنڈارا انھیں آزاد فقرا کے لئے ہوتا ہے۔مگر یہ دیکھا کہ حسب مدارج ان کے حصوں کی تعداد بھی معین تھی۔کسی کو دس کسی کو پانچ کھانے دیئے جاتے تھے۔علی ہذا قوال بھی زیادہ آتے تھے اور انکا بھی بجائے خود ایک معقول خرچ تھا۔

حالانکہ بظاہر شرکت عرس کے لئے حاضر ہوا تھا مگر مقصود میرا صرف حضرت وارث پاک کی زیارت تھی اور وہ نصیب ہوئی۔بلکہ اس موقعہ پر بعض ایسے اخوان ملت سے بھی ملاقات ہوگئی جن سے پہلے نہیں ملا تھا اور یہ تو روز دیکھتا تھا کہ بلاقید مذہب پروانہ وار لوگ آتے تھے اور حلقہ غلامی میں داخل ہوتے تھے اور انکی استعداد کے لحاظ سے ان کو ہدایت بھی ہوتی۔اگر کسی کو پیشوائے برحق نے ذکر و شغل کا کوئی قاعدہ تعلیم فرمایا تو کسی کو حفظ اوقات کی تاکید ہوئی۔کسی کو گوشہ نشین کیا،کوئی سیاحت عرب کے لئے بھیجا گیا لیکن محبت کی ہدایت ہر فرد کو ضرور ہوتی تھی۔

جب عرس ختم ہوا تو حضور نے ۱۷ شوال کو مجھے بھی رخصت فرمایا اور ارشاد ہوا کہ ''میلہ میں آنا''۔میں دیوئی شریف سے پچھرایوں آیا اور بدستور سابق مسجد میں قیام کیا اور چھ ماہ کے بعد بغرض شرکت میلہ کاتک پچھرایوں سے پیادہ پا چل کر ۱۴ جمادی الاول ۱۳۱۵ھ کو دیوئی شریف حاضر ہوا۔

اس مرتبہ ایک کرشمہ یہ دیکھا کہ بعض حلقہ بگوش ایسے بھی آئے تھے جن کا ظاہری مذہب عیسوی تھا اور بعض یہودی بھی نظر آئے۔بلکہ ایک آتش پرست مسمی دوسا بھائی بھی اسیر زلف وارثی دکھائی دیا لیکن اصولاً سب کا مشرب چوں کہ عین محبت تھا اسلئے باہمی اتحاد میں کوئی تفریق نہ تھی۔جس طرح مسلمان محو نظارہ جمال وارثی تھے اسی طرح ہندو،

عیسائی، یہودی، پارسی پروانہ صفت اس شمع بزم احدیت پر نثار ہوتے تھے۔ بقول:

مسلمان و ہندو و ترسا و گبر
ز خاک درت جملہ افسر کنند
چو کافور و صندل ازاں خاک پاک
بچشم اندر آرند و بر سر کنند

﴿جب اس کے در پہ پہنچے تو مسلمان اور بت پرست بلا امتیاز نوازے گئے اور مقام پا گئے جس اس مقدس خاک سے کافور اور صندل خوشبو اٹھتی ہے اور آنکھوں سے ہو کر دل میں اتر جاتی ہے۔﴾

اور پیشوائے برحق کی عنایت سب کے حال پر یکساں تھی۔ اس طبیب باطنی نے جس کے مرض کے مناسب جو نسخہ تجویز فرمایا۔ وہ اس کو تفویض ہوا۔ چنانچہ میرے حق میں ۱۷ تاریخ کو سرکار عالم پناہ نے یہ ارشاد فرمایا۔ ''تم بچھرایوں نہ جاؤ۔ بلکہ اناوہ میں جا کر دریا کے کنارے رہو۔ تمھارے پاس کسی کی ڈاک نہیں ہے''۔ میں نے دست بستہ عرض کیا کہ غلام کو کیا عذر ہے جو حکم ہو۔ لیکن پھر مصلحت وارثی نے اناوہ کا قیام کسی وجہ سے مناسب نہ جانا اور ۱۸ تاریخ کو یہ فرما کر مجھ کو رخصت کر دیا کہ۔ ''تم بچھرایوں جاؤ تمھارے باپ فقیر تھے۔ انھیں کی قبر پر رہو۔''

چنانچہ میں قدمبوس ہو کر بچھرایوں واپس آیا اور پھر شوال ۱۳۱۵ ہجری میں بدستور حضرت شاہ ولایت کے عرس میں حاضر ہوا اور ۱۸ شوال کو واپس آیا۔ بعدہ ۱۴ ربیع الثانی ۱۳۱۶ ہجری کو میلہ کاتک میں جب حاضری ہوئی تو علاوہ دیگر مشاہدات کے چند ضروری ہدایات سے مستفیض فرما کر حضور نے ۱۸ تاریخ کو رخصت فرمایا۔

لیکن بچھرایوں آ کر ایک ضرورت حاضری کی پیش آئی اور خلاف دستور ۲۵ جمادی الاول ۱۳۱۶ ہجری کو بچھرایوں سے پیدل روانہ ہوا اور شاہجہان پور میں آ کر معلوم ہوا کہ سرکار عالم پناہ موضع بابو پور ضلع سیتا پور میں رونق افروز ہیں۔ میں وہیں حاضر ہوا اور پانچ روز حضور نے وہاں قیام فرمایا۔ اسی دوران میں ایک شب مجھ کو اپنی حالت پر افسوس ہوا اور رو کر عرض کرنے لگا:

گدائے کوئے شمائیم وحاجتے داریم
رو امداد کہ محروم از آستاں نہ رویم

﴿میں تمھارے در کا گدا ہوں اور حاجت مند بھی میری مدد کرتا کہ میں مایوس نہ لوٹوں﴾

صبح کو قدمبوسی کیلئے حاضر ہوا تو فرمایا کہ تم کیا کرتے ہو؟ عرض کیا کہ حضور کا نام پاک

ورد میں ہے۔ارشاد ہوا کہ آج سے یہ ذکر کیا کرو جو ہم بتاتے ہیں اور اس کا قاعدہ معہ نشست وغیرہ کے تعلیم فرمایا۔

بابو پور سے جناب حضور موضع کبرا میں بادشاہ حسین خان صاحب تعلقدار کے مکان پر تشریف لائے۔ میں بھی ہمراہ رکاب تھا اور بھائی نعمت علی شاہ اور بھائی احد شاہ بھی اس سفر میں ساتھ تھے۔دوپہر کے وقت سرکار عالم پناہ نے بھائی احد شاہ سے فرمایا: ''تم دارجلنگ میں جا کر جنگل میں رہو اور مجھ سے یہ ارشاد ہوا: ''تم نیپال کے پہاڑ پر جاؤ وہاں تمہارے اور بھائی بھی ملیں گے اور راجہ کے یہاں سے تمھارے پاس دال اور چاول آئیں گے اور پتھر کے اوپر پتھر رکھ کر عارضی گھر بنا لینا''۔

یہ حکم پا کر ہم دونوں قدمبوس ہو کر رخصت ہوئے۔ہنوز بستی سے تقریباً دو فرلانگ باہر گئے ہوں گے کہ ایک شخص دوڑتا ہوا آیا اور کہا کہ حضور یاد فرماتے ہیں۔یہ فرمان مراجعت پہنچا تو واپس آئے۔ ارشاد ہوا: ''کھانا کھا چکے ہو یا نہیں ''عرض کیا کہ ابھی نہیں۔فرمایا: ''کھانا کھالو''۔ہم دونوں کھانا کھا کر پھر حاضر خدمت ہوئے۔اس وقت ارشاد ہوا کہ ''کل جانا ٹھہرو۔''

صبح کو نور محمد شاہ خادم خاص نے چھ روپیہ اور ایک تھان سفید نین سکھ کا مجھ کو دیا۔میں نے پوچھا یہ کس واسطے ہے تو انھوں نے کہا کہ میں کیا جانوں جا کر سرکار سے دریافت کرو۔میں اسی وقت حاضر خدمت ہوا اور نور محمد شاہ کا عطیہ جناب والا کے حضور میں رکھ دیا۔سرکار عالم پناہ بیٹھ گئے اور فرمایا: ''کیا ہے؟''میں نے عرض کیا: ''یہ چیزیں کیوں مرحمت ہوئی ہیں۔؟''ارشاد ہوا: ''یہ بچھرایوں تک کا کرایہ ہے۔'' عرض کیا کہ کرایہ چھ روپیہ اور چھ پیسہ ہے۔''۔آپ نے خادم سے فرمایا: ''چھ پیسے اور دو اور یہ سفید کپڑا ان کو نہیں دلوایا تھا۔رنگین تہبند دو''خادم نے جب چھ پیسے اور رنگین تہبند بھی مجھ کو دیا تو فرمایا کہ ''تم بچھرایوں جاؤ اور کہیں نہ جانا۔وہیں رہنا۔تمھارے باپ فقیر تھے۔اگر کبھی دل چاہے تو کسی فقیر سے مل آیا کرو یا کسی عرس میں چلے جایا کرو۔''اسی عرصہ میں بھائی احد شاہ حاضر ہوئے۔ان کو وہی حکم ہوا کہ دارجلنگ جاؤ اور ہم دونوں کو رخصت فرمایا۔

جس وقت میں قدمبوس ہوا تو فرمایا کہ ''پیلی بھیت ہو کر جانا''اور بھائی احد شاہ سے ارشاد ہوا کہ تم لکھنو ہو کر جانا'' چنانچہ ہم ریلوے سٹیشن تک پا پیادہ آئے تو معلوم ہوا کہ لکھنؤ جانے کی گاڑی پہلے جائے گی تو بھائی احد شاہ صاحب اس پر سوار ہو گئے اور مجھے رات کی گاڑی ملی اور

صبح کو پیلی بھیت پہنچا۔مگر شب سے یہ خیال تھا کہ شاید پیلی بھیت کا حکم اس لئے صادر فرمایا ہے کہ میاں محمد شیر صاحب سے بھی ملتا جاؤں۔اس واسطے پہلے میاں صاحب موصوف کی خدمت میں حاضر ہوا اور قریب ایک مسجد تھی اسی میں ٹھہرا جس کے حجرہ میں ایک درویش رہتے تھے۔ان سے معلوم ہوا کہ ان کو والد ماجد علیہ الرحمتہ نے یہاں بھیجا تھا۔اس لحاظ سے انھوں نے بہت عنایت کی اور بطور نصیحت اکثر لطائف معنوی بیان کئے اور یہ بھی کہا کہ تم کو جناب حاجی صاحب قبلہ نے میرے واسطے یہاں بھیجا ہے۔

دوسرے روز پیلی بھیت سے بریلی اور وہاں سے پھر ایوں آیا تو معلوم ہوا کہ اپنے پیر بھائی قطب عالم صاحب سے والد مرحوم نے عالم رویا میں یہ فرمایا کہ بدرالدین سے کہہ دو ہمارا عرس کیا کرے اور اسی مضمون کا خواب والد ماجد کی ایک مریدہ نے بھی دیکھا ہے۔اس مکرر ہدایت سے مجھ کو خیال ہوا کہ باوجود یکہ میری متوکلانہ حیثیت بظاہر اس بار کی متحمل نہیں لیکن حسب ارشاد اگر عرس نہ کروں گا تو والد کی ناخوشی کا باعث ہوگا۔اس لئے بقدر امکان کوشش کروں اگر خدا کو منظور ہوگا تو غیب سے سامان ہو جائے گا۔بقول

ع: خدا خود میر سامان است ارباب توکل را

﴿اللہ تعالیٰ توکل کرنے والوں کو خود سب کچھ پہنچاتا ہے﴾

چنانچہ تاریخ عرس سے قبل ہی مالک حقیقی نے اسقدر سامان کر دیا کہ ۱۱ ذیقعدہ ۱۳۱۶ ہجری کو میں نے والد ماجد کا پہلا عرس کیا۔ہر چند جملہ مراسم چھوٹے پیمانہ پر ہوئے مگر اعزا،اور احباب کا اجتماع کافی ہوگیا اور قوالی کا سماں ایسا دلچسپ ہوا کہ بعد قل کے سب نے بہ اصرار کہا کہ اب یہ عرس ہمیشہ ہوا کرے۔چنانچہ میں نے بھی اقرار کرلیا کہ انشاءاللہ ضرور کوشش کروں گا اور پیشوائے برحق کا افضال گر شامل حال ہے تو یہ عرس ہوا کرے گا۔

اس عرس کے بعد سے یہ غیر آباد مسجد بھی اس قدر آباد ہوگئی کہ اکثر نمازی بھی آنے لگے اور بعض احباب میری ملاقات کو بھی تشریف لاتے تھے لیکن اس مرتبہ کی حاضری میں چونکہ سرکار عالم پناہ نے سیر وسیاحت کی اجازت مجھ کو مرحمت فرمائی تھی۔اس لئے اکثر بزرگان طریقت کے اعراس میں شریک ہوا اور حضرات مشاہیر اہل تصوف کی خدمت میں بھی اس غرض سے حاضر ہوتا تھا کہ یہ شعائر ہیں۔ان کا مشاہدہ بالواسطہ جامع المتفرقین کا مشاہدہ ہے بقول

مراد ما ز تماشائے باغ عالم چیست
بدست مردم چشم از رخ تو گل چیدن

﴿دنیا کے باغ کی سیر سے میرا صرف یہی مقصد ہے کہ میں لوگوں کی آنکھوں کے ذریعے تیرے چہرے کے پھول چنوں۔﴾

چنانچہ اسی خیال سے ایک مرتبہ پنجاب کا سفر کیا اور سائیں توکل شاہ صاحب سے ملنے انبالہ گیا۔ کمل وغیرہ سرائے میں رکھ کر درِدولت پر حاضر ہوا تو دیکھا کہ ایک خادم دروازہ پر متعین ہے۔ دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ سائیں صاحب کا مزاج ناساز ہے۔ اس وقت ملاقات نہ ہوگی۔ میں نے کہا کہ دور سے آیا ہوں صرف اطلاع ہی کر دو مگر جب خادم نے اطلاع بھی نہ کی تو مجبوراً واپس آ رہا تھا کہ بازار میں ایک صاحب نے پکارا جو کسی دکان پر بیٹھے ہوئے تھے۔ میں ان کے قریب گیا تو ''شامتِ اعمال ماصورتِ ما درگرفت'' کا مضمون پیش آیا کہ اس قدر غیظ وغضب سے وہ معمور تھے کہ باوجود عدم واقفیت کے۔ کارو بدشعار وغیرہ کے خطابات مرحمت فرمائے اور بار بار میری بدکرداری کا اظہار کرنے لگے۔ مجھ کو حیرت ہوئی کہ سربازار یہ مسافر نوازی کیوں ہو رہی ہے مگر سکوت وخاموشی کے ساتھ ان کی ناقابل برداشت باتیں اور بدترین الزامات سنتا رہا بقول:

وفا کنیم و ملامت کشیم و خوش باشیم
کہ در طریقت ما کفریست رنجیدن

﴿میں وفا کرتا ہوں ملامت لیتا اور خوش رہتا ہوں کیونکہ میری طریقت میں مغموم رہنا کفر ہے۔﴾

لیکن شاید میری ہی وجہ سے جب میرے گروہ کے بعض افراد کی نسبت ثقیل ومکروہ الفاظ استعمال کئے اور خودساختہ اتہام دے کر ان کے افعال واقوال کی بے جا نکتہ چینی کرنے لگے تو یہ بہ اقتضائے بشریت اس خیال سے طبیعت کو ناگوار ہوا کہ بقول:

گر من آلودہ دامنم چہ عجب
ہمہ عالم گواہ عصمتِ اوست

﴿اگر میرا دامن آلودہ ہے تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں لیکن ان کی عصمت کی گواہی تو سارا عالم دیتا ہے۔﴾

ہر چند میں اسی لائق ہوں اور میرے حق میں جو کچھ ان کا خیال ہے وہ بجائے خود صحیح ہوگا۔ مگر افسوس میرے مذموم خصائل کی بدولت آج اخوان ملت بھی ہدف ملامت ہو رہے ہیں اور اس خدا کے بندے کو تعصب کے جوش میں دکھائی نہیں دیتا کہ فقرائے تہبند پوش کو متہم کرتا ہے لیکن عرصہ تک وہ ناآشنا شفیق نہ طعن وتشنیع سے باز آئے اور نہ ان کے تراشیدہ مضامین کا طولانی

سلسلہ ختم ہوا۔

جب ان کی زبان درازی حد سے گذر گئی تو دفعتاً مالک دکان کو غصہ آ گیا اور میرے مہربان ناصح کو اسی طریق سے جواب دیا اور انھیں لفظوں سے ان کی خدمت کی جو میری نسبت وہ استعمال کر رہے تھے۔ اس وقت وہ ہوش میں آئے اور خاموش ہو کر پند و نصیحت موقوف کی اور بالآخر اٹھ کر چلے گئے۔

دکاندار نے مجھ سے پوچھا کہ میاں صاحب آپ کا مکان کہاں ہے اور یہاں کس لئے آنا ہوا؟ میں نے کہا: ''بھائی! ضلع مراد آباد کا رہنے والا ہوں اور سائیں توکل شاہ صاحب سے ملنے آیا تھا۔ جب سائیں صاحب کا نام سنا تو اس کو اور محبت ہوئی اور نہایت شفقت سے کہا کہ میں بھی ان کا مرید ہوں لہٰذا آج آپ کی دعوت ہے۔ چوں کہ دعوت سے انکار کرنا میرے مشرب کے خلاف تھا اس لئے شب کو اس مسافر نواز کے یہاں کھانا کھایا اور سرائے میں آ کر سو رہا۔

صبح کو شہر کے مشہور مقامات دیکھے اور ہادیان طریقت کے مزارات پر حاضر ہوا اور دوپہر کو آ کر سرائے میں سو رہا تھا کہ ایک صاحب نے جگایا اور کہا سائیں صاحب آپ کو بلاتے ہیں۔ چوں کہ میں حاضر ہو چکا تھا اور دربان نے غیر مانوس شخص دیکھ کر اطلاع بھی نہیں کی تھی اس وجہ سے بے اختیار زبان سے نکل گیا کہ حقیقت تو یہ ہے کہ صرف سائیں صاحب کا اشتیاق زیارت مجھ کو یہاں لایا تھا اور پہلا کام بھی یہی کیا کہ ان کے در دولت پر حاضر ہوا لیکن دیکھا کہ باب امید مسدود ہے اور پہرہ دار بھی اس قدر تمیز دار تھا کہ مکرر کہنے سے بھی اس نے اطلاع نہ کی۔ اس کے عدم التفات سے یہ خیال ہوا کہ سائیں صاحب کو مجھ سگ دنیا سے ملنا منظور نہیں۔ اسلئے سمجھتا ہوں کہ اب جانے کی ضرورت نہیں۔

لیکن جب انھوں نے زیادہ اصرار کیا تو انکار کا بھی موقع نہ تھا۔ مجبوراً ان کے ہمراہ چلا۔ راستہ میں ایک مسجد کے قریب جا کر انھوں نے کہا کہ سائیں صاحب کے مرید قاری عبدالرحمٰن صاحب یہیں اس میں رہتے ہیں اور ان کو بھی آپ سے ملنے کا شوق ہے۔ اگر مضائقہ نہ ہو تو ان سے ملاقات کر لیجیے۔ میں نے بخوشی منظور کیا اور مسجد میں جا کر قاری صاحب سے صاحب سلامت کی تو موصوف کھڑے ہو گئے اور معانقہ کے بعد مجھے سرتاپا ٹٹول کر فرمایا جناب حاجی صاحب کا لباس یہی ہے۔ میں نے کہا: جی ہاں! میرے پیشوائے برحق ہمیشہ رنگین احرام زیب تن فرماتے ہیں۔ قاری صاحب نے کہا مجھے مدت سے حاجی صاحب کی زیارت کا شوق

تھا۔ الحمد اللہ کہ آج میری وہ دیرینہ آرزو یوں پوری ہوئی کہ تم سے ملاقات ہوگئی۔ جس کو میں سمجھتا ہوں کہ حاجی صاحب قبلہ کی زیارت نصیب ہوئی۔ بمصداق: ''نشانی اس کی چھلا ہے یہ چھلے کی نشانی ہے'' اب تم سائیں صاحب کے پاس جاؤ وہ دریافت فرما رہے ہیں۔

قاری صاحب سے رخصت ہوکر جب سائیں صاحب کے مکان پر آیا تو دیکھا کہ موصوف ایک سائبان میں آنکھیں بند کیے بیٹھے ہیں اور پائیں میں ایک مرید آپ کا مراقب ہے۔ چند ساعت میں کھڑا رہا اور یہ خیال ہوا کہ اگر سرکار عالم پناہ کی طرح سے ہاتھ بڑھائیں گے تو دست بوس ہوں گا ورنہ سلام کر کے بیٹھ جاؤں گا۔ اسی عرصہ میں سائیں صاحب نے آنکھ کھولی، میں نے سلام کیا۔ ممدوح نے سر سے پاؤں تک مجھ کو یا میرے لباس کو دیکھ کر چشم نم فرمائی اور میری جانب شفقت آمیز طریقہ سے ہاتھ بڑھایا۔ میں نے حسب ارادہ ہاتھوں کو بوسہ دیا اور سامنے بیٹھ گیا۔ سائیں صاحب نے پرجوش لہجے میں فرمایا کہ رسول کریم ﷺ دا اور حاجی صاحب دا فیض ساڈے نال آوندا ہے۔'' پھر ایک آہ کھینچ کر مجھ سے پوچھا کہ تم کو کس نے بھیجا ہے؟ عرض کیا: ''خدا نے'' پھر فرمایا: '' کیونکر آئے؟'' میں نے کہا: '' ریل پر'' پھر ارشاد ہوا کہ کہاں قیام کیا؟ میں نے کہا: '' آپ کے یہاں'' بعدہٗ اپنے ایک خلیفہ سے یہ حکم دیا کہ جاؤ ان کے ساتھ کھانا کھاؤ۔ وہ خلیفہ صاحب مجھ کو باہر لائے اور اپنے ہمراہ کھانا کھلایا۔ بعد فراغت میں پھر حاضر ہوا تو فرمایا کہ تم آج ہی سرہند شریف چلے جاؤ۔ میں سلام کر کے سرائے میں آیا اور اپنا کمبل لے کر شام کی گاڑی سے سرہند شریف روانہ ہوا۔

اتفاق سے وہی زمانہ عرس کا تھا۔ دور دور سے زائرین آئے تھے اور تقریباً ہر وقت قرآن خوانی ہوتی تھی۔ بعض درویشوں بھی سے ملاقات ہوئی اور بعد اختتام عرس میں لاہور چلا آیا اور مخدوم الملک حضرت داتا گنج بخش قدس اللہ سرہٗ العزیز کے مزار پر انور کی زیارت سے مشرف ہوا اور چند روز خانقاہ اقدس میں قیام کیا۔ شہر کے آثار قدیمہ بھی دیکھے اور دیگر مزارات پر بھی حاضر ہوا بلکہ راجہ رنجیت سنگھ کی منڈھی (مڑھی) پر بھی گیا۔

لاہور سے امرتسر آیا اور دربار صاحب یعنی گرونانک شاہ کے استھان پر گیا۔ پھر سہارنپور میں بعض مزارات کی زیارت کی اور بعدہٗ ہردوار آیا اور اندر جا کر گنگا کے کنارے بیٹھ گیا۔ ایک سادھو نے پوچھا کہ تم کون دودا ہو۔ میں نے کہا دوبد ہا چھوڑ دی ہے۔ تب اس نے پوچھا کہ تم کون ہو؟ میں نے کہا: تم نہیں دیکھتے کہ میں آدمی ہوں؟ اس نے کہا: '' مسلمان ہو یا ہندو؟'' میں نے کہا: '' دونوں سے علیحدہ۔'' غرض وہ غریب تو چلا گیا مگر اور چند سادھو مجتمع ہوکر

آئے جن میں سے ایک ایسے بھی تھے جو عہدہ ججی چھوڑ کر فقیر ہوئے تھے۔ اُنھوں نے مجھ سے دریافت کیا کہ آپ کس کے دیکھنے والے ہیں؟ میں نے کہا: ''جو آنکھ کے سامنے آتا ہے اسی کو دیکھتا ہوں۔'' اس پر وہ مسکرائے اور کہا مطلب میرا یہ ہے کہ آپ کس سلسلہ میں ہیں؟ میں نے کہا کہ عشق کے سلسلہ میں ہوں۔ تب اُنھوں نے کہا کہ میں آپ سے معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ آپ کس کے مرید ہیں؟ میں نے کہا: ''وارثی ہوں۔'' سادھو جی نے متعجب ہو کر کہا کہ وارثی تو کوئی خاندان نہیں۔ میں نے تھوڑی صراحت کے بعد یہ سمجھا دیا کہ اصل سلاسل سلسلہ وارثیہ ہے اور سادھو صاحب نے بھی اس کو مان لیا اور پھر سب سادھو ایسے دوست ہو گئے کہ تمام دن ان کے ساتھ وہاں کی سیر کرتا رہا۔

بعدہٗ ہردوار سے رکھی کیش گیا۔ وہاں بھی اکثر ایسے فقرائے ہند سے ملاقات ہوئی جو اپنے طریقے سے باخبر اور درحقیقت سادھو تھے۔ مگر تیغ محبت کا ایسا گھائل کوئی نہیں دیکھا جو ماسوائے شاہد مطلق دارین کے مفاد وضرر سے بے سروکار ہو۔

دیکھے پنڈت، سادھو، جوگی، سنت، ساد، ملنگ
پریم کا بھگتی ایک نہ پایا اوگھٹ چار الزگ

پھر رکھی کیش سے جوالا پور اور کنکھل ہوتا ہوا عین زمانہ عرس میں پیران کلیر شریف پہنچا۔ خلقت کا ہجوم تھا جس میں درویش بھی ہزاروں تھے۔ چنانچہ بعض معظم فقراء سے بھی ملاقات ہوئی لیکن والد مرحوم اکثر فرمایا کرتے تھے کہ چھنگا شاہ اور میران شاہ اور جعفر شاہ ہمارے ملنے والے ہیں اور درحقیقت وہ فقیر ہیں۔ یہ ارشاد مجھ کو یاد تھا اور ان کو تلاش کرتا تھا۔ مگر باوجود جستجو کے دو روز تک ان حضرات کی زیارت نہ ہوئی۔ اتفاق سے ایک شاہ صاحب نے بر سبیل تذکرہ جعفر شاہ کی تعریف کی تو میں نے پوچھا کہ وہ کہاں قیام پذیر ہیں کہا کہ احاطہ کے باہر بلند دروازہ کے قریب ملیں گے۔ میں نے وہاں جا کر تلاش کیا تو دیکھا کہ ایک درویش دھونی رمائے، بوریا بچھائے بیٹھے ہیں۔ میں نے شرف نیاز حاصل کیا تو مخاطب ہو کر فرمایا کہ آؤ۔ تم شمس الدین کے بیٹے ہو، وہ ہمارا یار تھا۔ اب ایسے فقیر نہیں ملتے اور پھر یہ بھی فرمایا کہ تم فقیر حاجی صاحب کے ہو۔ میں نے کہا: ''جی ہاں'' فرمایا کہ اس وقت ہندوستان میں وہ آفتاب ہیں۔ پھر خود ہی فرمایا کہ میران شاہ سے بھی ملے؟ میں نے عرض کیا: ''ابھی نہیں۔'' فرمایا: ''اچھا ٹھہرو'' اور ایک چلم میں چرس بھروا کر منگائی اور مجھ سے کہا کہ دم لگاؤ۔ میں نے انکار کیا۔ مگر شاہ صاحب نے جب اصرار کیا تو میں نے عرض کیا کہ اسی صورت میں آ کر فرمایئے جس کو میں نے پہچانا ہے

تو پی لوں گا۔ یہ سن کر وہ ہنسے اور فرمایا تم ضرور شمس الدین کے بیٹے ہو۔ اچھا جاؤ۔ وہ میران شاہ بیٹھے ہیں۔ ان کے اشارہ کے مطابق وہاں گیا تو یہ دیکھا کہ ایک صاحب پنجابی کرتہ اور چارکلی کی مخملی ٹوپی پہنے اور پنجابی لنگی باندھے۔ ڈاڑھی چڑھائے اس طرح بستر پر متمکن ہیں کہ کسی کو فقیر ہونے کا گمان بھی نہیں ہوسکتا۔ میں نے نہایت ادب سے سلام کیا تو بکمال جوش محبت جواب سلام دیا اور میری حالت پوچھ کر فرمایا کہ شمس الدین نے جس روز یہ غزل لکھی تھی۔ ''کہوں کیا رتبہ اعلیٰ علاؤالدین صابر کا'' اس روز ہم یہیں تھے۔ فیضان حضرت صابر سے وہ فقیر ہوئے ورنہ مشائخ تھے۔ پھر ریاضت ومجاہدات کا ذکر آتا تو اس سلسلہ میں فرمایا کہ ذاکر وشاغل ہونا بھی خدا شناسی کیلئے بہترین طریق ہے جو مسافر راہ طلب کا رفیق ہوتا ہے۔ مگر اے عزیز فقر اور چیز ہے جس کی یافت ریاضت ومجاہدات پر موقوف نہیں۔ بلکہ اس کا حصول عنایت وہبی اور اشارت پیشوا پر محمول ہے۔ تم کو کیا سمجھاؤں۔ تم فقیر کے بیٹے اور ایسے لاثانی فقیر کے دست گرفتہ ہو۔ دنیا میں جس کا مثل ونظیر نہیں۔ پھر کچھ عرصہ کے بعد فرمایا کہ جاؤ چھنگا شاہ سے بھی مل آؤ۔ وہ بھی تمھارے باپ کے یار ہیں۔ اندراوطاق بیٹھے ہیں۔

میں تلاش کر کے چھنگا شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ چونکہ وہ نابینا تھا اس لئے بآواز بلند سلام کیا۔ فرمایا کون ہے؟ عرض کیا۔ اوگھٹ شاہ۔ پوچھا کہاں کے رہنے والے ہو؟ میں نے کہا پھرایوں کا۔ فرمایا۔ شمس الدین کو جانتے ہو۔ عرض کیا: ''انھیں کا بدنام کنندہ بیٹا ہوں۔ ارشاد ہوا کہ مرید کس کے ہو؟ میں نے سرکار عالم پناہ کا نام نامی لیا تو فرمایا پیر تو بڑا پایا۔ اول تو سید، دوسرے فقیر ایسے کہ آج ان کے سوا کوئی فقیر نہیں۔ بقول ؎

امروز شاہ انجمن دلبران یکیست
دلبر اگر ہزار بود دلبر آن یکیست

﴿آج رونق محفل دلبران بس ایک ہی ہے۔ محفل میں اگر دلبر ہزاروں ہیں تو کیا ہوا سب کا دلبر فقط ایک ہی ہے۔﴾

اسی دوران میں نے عرض کیا کہ حکم ہو تو شیرینی لاؤں۔ فرمایا: ''اچھا! مگر حقہ بھی لانا۔'' میں فوراً لڈو اور ایک حقہ لایا اور سامنے پیش کیا تو صرف ایک لڈو رکھ لیا اور باقی تقسیم کر دیئے۔ بعدہٗ اس لڈو کے دو حصہ کیے ایک مجھ کو دیا اور ایک خود کھالیا اور عرصہ تک نصیحت فرما کر مجھ کو رخصت کیا اور بعد ختم عرس میں پھرایوں واپس آیا۔ الغرض یہ سفر بظاہر دلچسپ بھی اور بالمعنی مفید بھی تھا۔ دلچسپ اس لحاظ سے کہ مختلف شہروں کے قدیم آثار دیکھ کر شاہان سلف کی

خداداد شوکت وصولت کی یاد تازہ ہوئی اور اسی کے ساتھ جب ان کے مقابر نظر سے گذرے تو عبرت ہوئی اور دنیا کی بے ثباتی کا مرقع سامنے آ گیا۔ علاوہ اس کے ہر مقام پر مختلف اقوام کے باشندوں کے اخلاق وعادات سے واقف ہوا۔ جنگل کے قدرتی سبزہ زار کی بہار دیکھی۔ پہاڑوں کی خوشگوار ہوا سے صحت کو فائدہ پہنچا لیکن یہ مفاد تو نام نہاد ہیں۔ حقیقی مراد میری یہ نہ تھی بلکہ سیاحت کی اصل غایت جس کو مذہبی سعادت اور شرعی افادت کہنا چاہئے۔ الحمد اللہ وہ بھی نصیب ہوئی کہ مقتدایانِ طریقت کے مقدس آستانوں پر حاضر ہوا لہٰذا اگر ان کے مزارات کے فیوض وبرکات سے مستفیض ہونے کو سرمایہ زکیوں تو بے جا نہ ہوگا۔

مزید برآں موجودہ حضرات مشائخین کے مراحات معنوی سے میرے خیالات کو تقویت ہوئی۔ فقرائے ذی مرتبت کے فیضان صحبت سے تو وہ دولت لازوال حاصل ہوئی جس کا اندازہ بھی کرنا محال ہے۔ بقول حضرت مولانا:

یک زمانہ صحبتِ با اولیاء
بہتر از صد سالہ طاعت بے ریاء

﴿ولیوں کی صحبت میں بسر کی ہوئی ایک ساعت سو سالہ بے ریا عبادت سے بہتر ہے۔﴾

علی ہذا بعض فقرائے ہند کا ویران پہاڑوں اور سنسان جنگلوں میں باوجود بے سروسامان ہونے کے خوش وخرم رہنا اور بکمال صبر واستقلال زاہدانہ زندگی بسر کرنا ایک ایسا نظارہ تھا جس سے نوآموز فقیر قناعت واستقامت کا معقول سبق لے سکتا ہے۔

لیکن قطع نظر ان تمام خوبیوں کے اس سفر سے مخصوص فائدہ مجھ کو یہ ہوا کہ پیشوائے برحق کے مراتب علیا کی جب تمامی اہل اللہ نے صریح الفاظ میں تصدیق فرمائی تو میرا یہ خیال اور مضبوط وپختہ ہوگیا کہ اقلیم فقر کے شہنشاہ اور اسرار عشق سے آگاہ صرف ہمارے سرکار عالم پناہ ہیں۔ اسلئے کہ میری نگاہ میں وہ درویش جو یقینی اہل باطن اور خدا رسیدہ تھے۔ سب نے بیک زبان حضور کی عظمت وشان کا اقرار کیا اور جس کے سامنے ہادی کامل کا نام لیا۔ اس نے مرعوب ہوکر سر تسلیم خم کیا اور اس وقت ان کے قیافہ سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ یہ خداشناس راہ فقر میں ہمارے وارث پاک کے دست نگر ہیں بلکہ اکثر مجاذیب نے صرف میرے لباس کی وجہ سے ایسی تکریم کی جس کے لائق میں ہرگز نہ تھا اور ان کا عجز وانکسار زبان حال سے کہتا تھا کہ بارگاہ وارثی کے یہ فرمانبردار ہیں۔

مگر جس طرح یہ سفر میرے حق میں مبارک ومیمون ہوا۔ اسی طرح بعد مراجعت بہ

تازہ جنون روز افزوں ترقی کرنے لگا اور قدرتاً یہ تحریک دل میں پیدا ہوئی کہ شبانہ روز کی دوری اب ناقابل برداشت ہے۔ کسی طریق سے جلد از جلد بلکہ روزمرہ بارگاہ حبیب کی آستان بوسی نصیب ہو۔ اسی خیال سے بجائے سکون، قلب کو اضطرار اور بجائے اطمینان ایسا انتشار رہنے لگا کہ ہر چند مسجد کی خدمت بدستور کرتا تھا۔ مگر غم مہجوری سے جب زیادہ رنجور ہوتا، زار زار روتا اور تصور میں اپنے آقائے نامدار سے عرض کرتا۔ بقول

یاران ہمنشیں ہمہ ازہم جدا شدند
مائیم آستانۂ دولت پناہ تو

﴿میرے ہمنشیں دوست بھی مجھ سے جدا ہو گئے میرے لئے صرف آپ کا آستانہ ہی پناہ گاہ ہے۔﴾

بندہ نواز! یہ دور افتادہ غلام تیری جدائی میں مبتلائے رنج و آلام ہے۔ شب فراق کی تنہائی کیونکر نہ شاق ہو۔ ''نہ مونسے نہ شفقے نہ ہمدمے دارم'' اس بلا رسیدہ نو گرفتار دام محبت کو تیری عنایت درکار ہے۔ بقول:

میسوزم از فراقت رو از جفا بگردان
ہجران بلائے ماش یارب بلا بگردان

﴿میں جدائی کی آگ میں جلتا ہوں جفا چھوڑ دے۔ یا اللہ یہ ہجر بری بلا ہے اس سے چھڑا لے۔﴾

مگر دشواری یہ تھی کہ ادھر تو شوق زیارت میں دل بے چین ادھر میری حاضری کیلئے حسب فرمان وارثی زمانہ عرس شوال متعین جس کو تین مہینے باقی تھے اسلئے بمصداق ''نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن'' کا مضمون تھا بقول:

اضطرابم نہ گزارد کہ نشینم جائے
انتظارت نہ گزارد کہ زجا برخیزم

﴿بے چینی مجھے ایک جگہ ٹک کر بیٹھنے نہیں دیتی اور تیرا انتظار مجھے اپنی جگہ سے اٹھنے نہیں دیتا۔﴾

لیکن کارساز حقیقی نے یہ کرشمہ دکھایا کہ اسی عرصہ میں جناب شاہ فضل حسین صاحب کا والا نامہ آیا جس میں موصوف نے تحریر فرمایا تھا کہ:

تازہ شوائے دل پژمردہ کہ چوں آب حیات
بحر جودیست کہ سوئے تو روان می آید

﴿اے افسردہ دل تازہ ہو جا جس طرح آب حیات تازہ دم کرتا ہے کیونکہ فیوض و برکات کا

سمندر تیری طرف چل پڑا ہے۔﴾

سرکار عالم پناہ مقام دھرم پور نواب عبدالشکور خان صاحب کے مکان پر تشریف لے جائیں گے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تم بھی وہیں حاضر ہو کر سعادت قدمبوسی حاصل کرو۔

شاہ صاحب ممدوح کی ہدایت کے بموجب تاریخ معینہ سے دو روز پہلے مرادآباد آیا اور پھر چندوسی ہو کر اسٹیشن کیسر پر حضور کی آمد کا منتظر رہا۔ حتیٰ کہ وقت مقررہ پر جناب والا تشریف لائے اور علاوہ نور محمد شاہ و فیضو شاہ خدام خاص کے ٹھاکر پنچم سنگھ صاحب وارثی رئیس ملاوی ضلع مین پوری بھی ہمراہ رکاب تھے اور اسی وقت علی گڑھ سے جو گاڑی آئی اس سے بابو کنہیا لال صاحب وکیل جن کو بعد میں غلام وارث کا خطاب نصیب ہوا اور اب ٹرسٹ کمیٹی مقبرہ شریف کے سیکرٹری ہیں اترے اور اسی سے معصوم شاہ صاحب وارثی جن کا قیام دہلی میں زیادہ رہتا تھا آئے۔

قریب اسٹیشن نواب صاحب نے خیمہ استادہ کرایا تھا۔ اس میں جناب حضرت نے تھوڑی دیر کے واسطے استراحت فرمائی اور یکے بعد دیگرے غلامان وارثی قدمبوس ہوئے جب معصوم شاہ حاضر ہوئے تو فرمایا: ''تم کیوں آئے'' معصوم شاہ نے عرض کیا کہ دہلی جا رہا تھا۔ شوق قدمبوسی میں اتر گیا ہوں۔ حکم ہوا: ''تم ابھی چلے جاؤ''۔ اس حکم قطعی سے بھائی معصوم شاہ بجائے محزون و ملول ہونے کے مسرور و محظوظ ہو کر خیمہ سے باہر آئے اور مکلیف ہو کر روانگی کا سامان کرنے لگے۔ ان کی اس حالت سے صاف ظاہر تھا کہ دستور محبت یہی ہے کہ طالب شوق دید میں پروانہ وار حاضر ہو اور جب محفل مطلوب سے بہزار رسوائی نکالا جائے تو لازم ہے کہ اپنی اس ظاہری ذلت کو بھی عین عزت سمجھے بقول حضرت جامی علیہ الرحمتہ:

خوش آن روزے کہ گفتی باحریفان چون مرادیدی
کہ این مسکین بکوئے ماچرا بسیار میگردد

﴿اس دن بڑی خوشی ہوئی جب اس نے مرے حریفوں سے کہا کہ یہ مسکین اکثر میرے کوچے میں کیوں گھومتا رہتا ہے۔﴾

لیکن اس وقت چوں کہ کوئی گاڑی نہیں جاتی۔ اس لحاظ سے نواب صاحب نے عرض کیا کہ حضور مجبوری یہ ہے کہ اب گاڑی انھیں شب کو ملے گی۔ سرکار نے یہ عذر منظور فرمایا اور ارشاد ہوا۔ ''اچھا رات کو چلے جاویں''۔

نواب صاحب نے مجھ سے کہا کہ تم بھی قدمبوسی کر آؤ۔ شاید انھیں کے ساتھ تم کو بھی

جاناپڑے ۔ چنانچہ میں جب قدمبوس ہوا تو فرمایا: ''کون ہے؟'' عرض کیا: ''اوگھٹ شاہ'' ارشاد ہوا: ''تم پچھرایوں میں اپنے باپ کی قبر پر رہتے ہو''؟ میں نے عرض کیا: ''جی ہاں ! پچھرایوں یہاں سے قریب ہے ۔'' فرمایا: ''تو یہ تمھارا علاقہ ہے ۔ اچھا ٹھہرو ۔'' بعد رفع تکان سرکار عالم پناہ پالکی میں سوار ہوئے اور جلو میں غلاموں کا ہجوم اسٹیشن کیسر سے غالب پور چلا ۔ بقول

بعزم گشت چو آن نازنین سوار شود
ہزار خستہ دلش خاک رہ گزار شود

﴿جب اس نازنین نے سوار ہونے کا ارادہ کیا تو ہزاروں خستہ دل اس کے راستے کی دھول بن گئے ۔﴾

موضع غالب پور قصبہ ڈیائی سے قریب تھا اور نواب صاحب نے اس کا شکور گنج نام رکھا تھا اور یہیں سکونت کا خیال تھا ۔ اسلئے یہاں عالیشان کوٹھی تعمیر کرائی تھی لیکن ایک چھت اس کی ہمیشہ گرا کرتی تھی ۔ اس وجہ سے بعض کا خیال تھا کہ اس میں کسی جن کا گذر ہے اور وہی ہمیشہ چھت گرا دیتا ہے ۔

چنانچہ نواب صاحب پہلے سرکار کو اسی نو تعمیر کوٹھی میں لائے اور مقصود یہ تھا کہ دھرم پور لے جائیں گے کیونکہ وہیں دعوت کا انتظام کیا تھا ۔ مگر جناب والا نے ترش رو ہو کر فرمایا: ''اب ہم یہیں رہیں گے ۔'' خدام نے عذر کیا اور اس حکم میں ترمیم چاہی تو حضور نے ان کو نظر گرم سے دیکھا اور مکرر فرمایا کہ: ''نہیں اب یہیں رہیں گے'' ۔ اس وقت نواب صاحب بہت پریشان تھے مگر ٹھاکر پنچم سنگھ صاحب نے یہ جسارت کی کہ خدمت عالی میں حاضر ہو کر قدمبوس ہوئے ۔ حضور نے فرمایا: ''ٹھاکر اب ہم یہیں رہیں گے'' ۔ ٹھاکر صاحب نے عرض کیا: ''بہتر ہے ۔ آپ یہیں قیام فرمائیں لیکن نواب صاحب کو بہت دقت ہوگی ۔ دھرم پور سے کل سامان منگانا ہوگا ورنہ حضور کے مہمانوں کو تکلیف ہوگی ۔''

چوں کہ مزاج ہمایوں کا انداز کریمانہ تھا ۔ کسی کی معمولی تکلیف بھی کبھی گوارا نہ ہوتی تھی اسی لحاظ سے اس وقت بھی شفقت وارثی کو اپنے غلاموں کی راحت کا خیال ہوا اور فرمایا کہ: ''اچھا وہیں چلو ۔ ورنہ مہمانوں کو تکلیف ہوگی'' ۔ پھر کیا تھا ۔ فوراً پالکی آئی ۔ حضور سوار ہوئے اور ایک گھنٹہ میں دھرم پور پہنچ گئے ۔ اس وقت نواب صاحب کا جوشِ مسرت زبانِ حال سے کہتا تھا ۔

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

مجھے خوب یاد ہے کہ تاریخ ۵ رمضان المبارک پنجشنبہ کا روز تھا کہ قریب عصر حضور کی سواری دھرم پور پہنچی ۔شب کو نواب صاحب سے مخاطب ہو کر فرمایا: ''کل جمعہ ہے۔نماز کون پڑھاتا ہے؟''

نواب صاحب نے عرض کیا کہ مولوی پرورش علی صاحب پڑھاتے ہیں ۔ جناب والا نے حافظ خدا بخش صاحب سے (جن کو بعد میں احمد شاہ کا خطاب مرحمت ہوا) فرمایا: ''مولوی صاحب کے ساتھ ٹھیکہ نہیں ہے۔کل تم نماز پڑھانا اور خطبہ چھوٹا پڑھنا'' اور بابو کنہیا لال صاحب سے ارشاد ہوا: ''کل سے تم بھی روزہ رکھو اور ہمارے ساتھ نماز پڑھنے چلنا۔''

چنانچہ بابو صاحب نے شب بھر میں ارکان نماز یاد کئے اور حافظ صاحب نے مختصر خطبہ تالیف کیا اور بعد نصف النہار سرکار عالم پناہ نماز جمعہ کیلئے تشریف لے چلے ۔جلو میں غلامان وارثی کا اژدھام تھا۔ جب مسجد میں پہنچے تو دیکھا کہ بستی کے بہت لوگ مجتمع ہیں ۔حافظ صاحب نے وہی خطبہ پڑھا اور نماز میں چھوٹی چھوٹی سورتوں کی قرآت کی ۔صف اول میں حضور تھے اور عقب حضور بابو کنیا لال اور ٹھاکر پنچم سنگھ اور ہم سب غلام تھے ۔ بعد نماز میلاد شریف ہوا ۔ جب شیرینی تقسیم ہونے لگی تو جناب حضرت پالکی میں سوار ہوئے اور مکان پر تشریف لائے ۔

شب کو حاضر خدمت ہوا تو مجھے دیکھ کر پنچم سنگھ صاحب سے فرمایا: ''ٹھاکر دوسرے کی چیز لے کر احسان مند ہونا نہ چاہیے اور اگر لے تو اس کا بدلہ کرے۔'' باہر آ کر ٹھاکر صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ سچ بتاؤ۔ حضور نے یہ کیوں ارشاد فرمایا کہ روئے سخن اس ارشاد کا ضرور تمھاری جانب تھا کیونکہ جناب حضرت کا انداز کلام یہی ہے کہ جس سے خطاب کرنا منظور ہوتا ہے اس سے نہیں بلکہ دوسرے سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں ۔اسلئے میرا خیال یہ ہے کہ تخاطب گو میری طرف تھا۔مگر مقصود تمہیں ہو گے کہ سوائے تمھارے اس وقت کوئی اور حاضر نہ تھا۔

میں نے غور کیا تو عنایت وارثی نے مجھ کو اپنے قصور پر آگاہ کر دیا اور سمجھ میں آ گیا:

سوئے من بود اشارت غمزہ
گرچہ با دیگران سخن میگفت

﴿ خاص ادا سے اشارہ میری طرف تھا اگر چہ روئے سخن دوسری جانب تھا۔ ﴾

بیشک یہ مری تنبیہ کیلئے ارشاد ہوا ہے۔ چنانچہ ٹھاکر صاحب سے اپنا حال بیان کیا کہ

چونکہ کمبل تو قوالوں نے لے لیا تھا۔ اس وجہ سے میرے دوست خواجہ حسن صاحب نے اپنی رضائی ساتھ کر دی کہ سردی کی تکلیف نہ ہو۔ وہی اس وقت اوڑھے ہوئے تھا۔ شاید میرے غیور بندہ نواز کو منظور نہ ہوا کہ ہمارا غلام کسی صورت سے بھی غیر کا مرہون احسان ہو۔

ٹھاکر صاحب کو تو فی الجملہ اطمینان ہو گیا لیکن میں اپنی اس غلطی پر اس قدر نادم وشرمسار ہوا کہ بیت وارثی سے تمام شب مضطر وبیقرار رہا۔ جب قلب زیادہ بیتاب ہوتا تو بستر پر مثل ماہی بے آب تڑپتا اور آقائے نامدار سے عفو تقصیر کا خواستگار ہوتا اور بہزار عجز وانکسار عرض کرتا:

بادشاہا جرم ما را درگذار
ما گنہگاریم تو آمرزگار

﴿اے بادشاہ! میری خطا معاف کر دے میں گنہگار ہوں اور تو بخشنہار ہے۔﴾

صبح کو ہر چند حجاب ندامت سے محجوب تھا۔ مگر شوق قدمبوسی میں حاضر خدمت ہوا۔ اس وقت سرکار عالم پناہ کابلی دُسہ اوڑھے تھے۔ حضور نے وہ دوش مبارک سے اتار کر مجھ کو مرحمت فرمایا۔ میں نے اس خلعت فاخرہ کو آنکھوں سے لگایا اور باہر آ کر رضائی رکھ دی اور وہی قیمتی دُسہ اوڑھ کر شاداں وفرحاں پھرنے لگا۔

بعدۂ ظہر کے وقت حاضر خدمت ہوا تو فرمایا: ''اوگھٹ شاہ سنو۔ فی انفسکم افلا تبصرون۔ سمجھ گئے''۔ اس ارشاد کے پردہ میں فیضان وارثی نے یہ کرشمہ دکھایا کہ دفعتاً قلب کی حالت اس عنوان سے بدل گئی جس کی حقیقی کیفیت کا اظہار لفظوں میں کرنا دشوار بھی ہے اور ممنوع بھی۔ بقول:

نہ راز خلوت شاہان ہر کس می تواں گفتن
نہ سرِ سینہ مردان سزائے قلب سنگین است

﴿شہنشاہوں کے خلوتی راز دوسروں سے نہیں کہنے چاہئیں ان کے دل ان رازوں کو برداشت نہیں کر سکتے۔﴾

مگر اس انتشار میں بے ساختہ یہ ضرور عرض کیا کہ حضور سمجھ گیا لیکن کوئی دریافت کرے کہ تم کیا سمجھے تو اسی قدر کہہ سکتا ہوں کہ جو کچھ سمجھا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اس بیخودی میں یہ ہوش آیا کہ قبل اس کے جس قدر سمجھ چکا تھا وہ فراموش کیا اور یہ تلقین ایسی مؤثر ہوئی کہ باوجود نا سمجھی کے دل کو تسکین ہو گئی اور مجھ نافہم کی سمجھ میں آ گیا کہ اس کثرت میں درحقیقت وہی وحدت حقیقی جلوہ

گر ہے۔ جوتمام عالم کی جان بلکہ عین ایمان ہے بقول حضرت مولانا علیہ الرحمۃ:

اتصال بے تکیف بے قیاس
ہست رب الناس را با جان ناس

حالانکہ اس آیہ وافی ہدایہ کی بارہا تلاوت کی تھی۔ اس کا ترجمہ بھی پڑھا تھا۔ اس کی تفسیر بھی دیکھی تھی۔ علمائے عظام نے جونکات ولطائف اس کے تحت بیان فرمائے ہیں وہ بقدر استعداد مجھ کو یاد تھے۔ حتیٰ کہ مشاہیر حضرات صوفیہ کرام نے اس آیہ کریمہ کے سلسلہ میں جورموز معنوی ظاہر فرمائے ہیں ان سے بھی آنکھیں مستفیض ہوچکی تھیں۔ مگر میری اس تمام واقفیت کی رسائی صرف تحریر وتقریر کے احاطہ میں محدود تھی۔ نہ حقانیت سے تعلق نہ روحانیت سے سروکار تھا۔ بقول:

علم رسمے سربسر قیل است و قال
نہ ازو کیفیتے حاصل نہ حال

﴿علم قیل وقال کی رسم ہے جس سے نہ کیفیت حاصل ہوتی ہے اور نہ حال﴾

لیکن پیشوائے برحق کی قوت کاملہ کی یہ روشن دلیل ہے کہ جب اس واقف رموز واسرار وکاشف غوامض واستار نے اس آیہ پاک کی تلاوت فرمائی تو محض اس کی سماعت سے مجھ ایسے نافہم کے ادراک نے تصدیق کی کہ لاریب فیہ یہ آیت سریان وجود کی قطعی شاہد ہے۔

اگر جناب حضرت اس آیت کے اسرار غوامض اظہار فرماتے اور مسترشدین کو نکات معنوی سے آگاہ کرتے تو حیرت کی گنجائش نہ تھی۔ تعجب ہے تو اس کا ہے کہ حضور نے ترجمہ بھی نہیں بیان کیا اور صرف ایک لفظ ''سمجھے'' اس انداز سے فرمایا اور اس کا یہ گہرا اثر ہوا کہ مجھ ناسمجھ کو یہ سمجھ مرحمت ہوئی کہ عقل وشعور کی رسائی سے جو سمجھا تھا وہ دفعتاً لوح ذہن سے محو ہوگیا بقول:

''جو پڑھا لکھا تھا نیاز نے اسے صاف دل سے بھلا دیا''

اصل یہ ہے کہ ایسے بدیہی اور پراثر فیض کا وقوع بجز تاثیرات عشق کے اور کسی قوت سے ناممکن ہے اور چونکہ سرکار عالم پناہ کا مشرب عین عشق ہے اسلئے آپ کے جملہ اقوال وافعال میں تاثیر عشق ایسی مضمر تھی کہ ہر چند آپ کسی زبان میں کوئی مضمون ادا فرمائیں مگر وہ اپنی حقیقی تاثیر سے ضرور معمور ہوگا اور مخاطب بھی کسی حیثیت کا کیوں نہ ہو لیکن آپ کے مقدس کلام کے اثر سے اس کو متاثر ہونا لازمی ہے اور اثر بھی وہی ہوگا جو عشق کا خاصہ ہے کہ ''یحرق ماسوی

المحبوب ''۔یعنی وجودغیراللہ مفقودہوجائے۔بقول مولانا رحمۃ علیہ:

عشق آن شعلہ است کو چون برفروخت
ہرچہ جز معشوق باقی جملہ سوخت

﴿عشق ایسا شعلہ کہ جب بھڑکتا ہے تو معشوق کے علاوہ ہرچیز کوجلادیتا ہے﴾

اوریہی اثرعشق عین توحید ہے کہ ذرات کائنات میں ایک شاہد حقیقی کے ظہور ہمہ گیر کی تصدیق ہوجائے۔جیسا کہ ہمارے شہنشاہ اقلیم عشق کے افاضہ باطنی کی تاثیرنمایاں ہوئی کہ آن واحد میں اپنی قوت روحانی سے مجھ نااہل کے قلب غیرمطمئن کوخدشات کثرت کی کثافت سے صاف کیااورتوحیدحضرت واجب الوجودکی تصدیق مرحمت فرمائی۔

ایک بارکیا بلکہ متواتر دیکھا ہے کہ حضور کے تصرفات کا عموماً یہی انداز تھا اور اکثر اخوان ملت کی تربیت آپ نے اسی صورت سے فرمائی کہ معمولی تقریر کے پردہ میں ان کوفائزالمرام کیا۔اسلئے تعجب کا مقام نہیں ہے کہ ایک آیت کی تلاوت نے مجھ کوایسا مکیف کردیا جس کی محویت سے باہرآکر میں عرصہ تک مبہوت بیٹھا رہا۔

لیکن حسب دستور بعدعصر بھی قدمبوسی کیلئے حاضر ہوناضرورتھا۔اس وجہ سے اسی حالت میں سعادت حضوری حاصل کی توجناب حضرت نے بہ نظرترحم فرمایا:

''اوگھٹ شاہ! ع: ان بتوں میں ایک دن ان کوخدا مل جائے گا''

اورمسکراکرمنہ پھیرلیا۔اس بشارت سے قلب کوتواطمینان ہوگیامگرمسکراکے منہ پھیرلینا ایسادل آویزانداز تھا جس نے بیقرارکردیا۔قریب تھا کہ آہ سرداس خوشگوار درد کا اظہار کرتی کہ دانندہ مافی الضمیر نے ایک گھونسہ مارکرفرمایا:''جاؤ!ٹھہرو''۔میں کمرہ سے باہرآیا اورجوش مسرت میں اس عنایت وپرورش کاشکراداکرنے لگا کہ

اے خوش آن دم کہ گوش میکردم
نکتہ از لب شکر شکست

﴿وہ لمحہ کتنا اچھا تھا جب اس کی طرف کان کیااوراس کے میٹھے لبوں سے بات سنی۔﴾

اس موقع پر ماموں حافظ عبدالمجید صاحب اور بھائی حافظ ظفرالدین صاحب اور چودھری تجمل حسین صاحب بھی شوق قدمبوسی میں حاضر ہوئے تھے۔چنانچہ دھرم پور سے روانگی کے وقت جب کہ سرکارعالم پناہ سوارہونے تشریف لارہے تھے تو یہ لوگ بھی قدمبوس ہوئے۔ جناب والا نے تھوڑاتوقف فرمایااورارشادہوا کہ:''خط آیا ہے کہ اوگھٹ شاہ چارپائی پربیٹھتا

ہے"۔ان تینوں غلاموں نے بیک زبان عرض کیا کہ حضور کو یہ اطلاع کسی نے غلط دی ہے۔پھر جناب والا نے فرمایا کہ پچھرایوں سے خط آیا ہے کہ اوگھٹ شاہ چارپائی پر بیٹھتا ہے اور کرتہ بھی پہنتا ہے"۔ان لوگوں نے مکرر وہی عرض کیا کہ قبلہ عالم یہ خبر بالکل خلاف واقعہ ہے۔حضور نے فرمایا کہ "ضرور غلط ہے اوگھٹ شاہ ایسا نہیں ہے۔اس نے کہا ہے کہ لعنت ہے اس پر جو ایک طریقہ چھوڑ کر پھر اسی کو اختیار کرے" اور خادم سے ارشاد ہوا کہ اوگھٹ شاہ کو بلاؤ۔میں حاضر ہوا تو فرمایا: "دیکھو اوگھٹ شاہ پچھرایوں میں نوک سے رہنا" میں نے عرض کیا کہ حضور نوک سے رہنے کا صحیح مفہوم یہ غلام نہیں سمجھا۔ارشاد ہوا کہ "بے لاگ اور بے غرض آن بان سے رہنا کسی سے دب کر نہ رہنا۔" میں قدمبوس ہوا تو فرمایا: "ہمارے ساتھ چلو اور آپ پالکی میں سوار سنڈول روانہ ہوئے ہم لوگ جلو میں چلے۔مگر ماموں صاحب وغیرہ وہیں سے پچھرایوں واپس گئے۔

سنڈول کے راستہ میں ایک کنواں ملا جس کا قطر اتنا بڑا تھا کہ آٹھ مونٹھ بیک وقت جاری تھے۔یہ دیکھ کر نور محمد شاہ خادم خاص نے عرض کیا کہ حضور ملاحظہ فرمائیں۔اس اندازہ پر آٹھ پُر چل رہے ہیں۔آپ نے پالکی سے اتر کر دیکھا اور یہ فرما کر فوراً سوار ہو گئے کہ ہم نے اس سے بڑا اندازہ دیکھا ہے۔

ہم نافہموں کو اس کا ادراک بھی نہیں ہوا کہ معمولی چیز دیکھنے کیلئے حضور نے کیوں تکلیف فرمائی لیکن بعد کو ظاہر ہو گیا کہ نہ وسیع کنواں ملاحظہ فرمانا مقصود تھا۔نہ یہ غرض تھی کہ آٹھ پُر چلنے کا تماشا دیکھیں بلکہ ایک ازلی ارادتمند کی حمایت منظور تھی۔کیونکہ جس طرح یہ مصدقہ ہے کہ بروز میثاق منعم حقیقی نے قلب عشاق کو جوہر محبت ودیعت فرمایا۔بقول:

سلطان ازل گنج غم عشق بما داد
تا روئے درین منزل ویرانہ نہادیم

﴿سلطان ازل غم کا خزانہ عشق مجھے عطا کیا تا کہ اس منزل میں ہم ویرانہ کی بنیاد رکھیں﴾

اسی طرح یہ بھی مسلمہ ہے کہ ہادیان راہ حق نے عالم ارواح میں جن کی ہدایت فرمائی ہے ان کے وہ ہمیشہ نگران حال رہتے ہیں اور وہ مسترشدین جب عالم اعیان میں آتے ہیں تو بلحاظ اتحاد قدیم ان کو بھی دست گیر کے ساتھ ارادت ہوتی ہے اور ان کا فطری جوش زبان حال سے کہتا ہے بقول:

درازدل دادہ است مارا ساقی لعل لبست

جرعہ جامے کہ من سرگرم آن جامم ہنوز

﴿میرے لعلیں لب ساقی نے مجھے بڑا دل دیا ہے اور وہ گھونٹ جس نے مجھے از سر رفتہ کر دیا ہے ابھی جام کے اندر ہے۔﴾

اور ان کو ہادیٔ کامل اس عالم میں بھی مدد و معاون ہوتا ہے اور حصول رضائے حق کی ہدایت فرماتا ہے اور اپنے فیضان باطنی سے مستفید کرتا ہے۔ جیسا کہ حضور نے اپنے ایک ازلی حلقہ بگوش کیلئے یہ اہتمام فرمایا کہ بمصداق "کُلُّ اَمرٍ مَرھُوْنٌ بِاَوْقَاتِھَا"۔ جب اس کی ہدایت کا وقت آ گیا۔ پالکی سے اترے اور کنویں پر کام کرنے والے مزدوروں میں سے اس کو نکال کر اپنے ظل عاطفت میں لیا اور وہ ذی ہوش بھی اتحاد و یگانگت کے جوش میں اپنے حقیقی رہنما کی جانب رجوع ہو گیا۔

چنانچہ اپنی آنکھوں سے یہ کرشمہ دیکھا کہ جو لوگ پُر چلا رہے تھے باقی سب تو اسی کام میں مشغول رہے لیکن ان میں سے ایک شخص جو قوم کا راجپوت تھا کام چھوڑ کر آیا اور ہم لوگوں کی طرح پالکی کے ساتھ چلا۔ سنڈول پہنچ کر اس نے نہایت پر جوش لہجہ میں مجھ سے کہا کہ میاں صاحب مجھ کو بھی گرو مہاراج کا چیلا کرا دو۔ میں اس کو خدمت والا میں لایا اور اس کی استدعا کا اظہار کیا۔ حضور مسکرائے اور اسی وقت اس کی بیعت لی اور فرمایا۔ "جاؤ مرید ہو گئے۔"

چونکہ مشتاقان جمال وارثی کا ہجوم تھا اور بکثرت اہل عقیدت داخل سلسلہ ہو رہے تھے۔ اسلئے میں دروازہ پر کھڑا ہو گیا اور ہر ایک حلقہ بگوش کو شجرہ دینے لگا۔ بلکہ بابو کنیالال صاحب بھی میرے ساتھ اسی انتظام میں مصروف تھے کہ ناگاہ وہی ہندو راجپوت میرے پاس آیا اور کہا کہ یہ کاغذ مجھ کو بھی دو۔ میں نے کہا: "تم اس کو کیا کرو گے؟" اس صادق الارادت نے برجستہ کہا کہ قیامت کے دن جب خدا مجھ سے پوچھے گا کہ تو بھی مرید ہوا تو میں یہ کاغذ اس کے ہاتھ میں دیدوں گا کہ دیکھ لے۔ بابو صاحب موصوف نے کل شجرے میرے ہاتھ سے لے کر اس کو دے دیئے اور مکیف ہو کر کہنے لگے کہ ایسے ہی عقیدت شعار حلقہ بگوش شجرہ رکھنے کے مستحق اور سزاوار ہیں۔

الغرض جس طرح دھرم پور میں ہزاروں عقیدت مند ظل حمایت وارثی میں پناہ گزین ہوئے اسی طرح سنڈول میں سینکڑوں اہل ارادت شرف بیعت سے مشرف ہوئے۔ بالآخر حضور اترولی ریلوے اسٹیشن سے سوار ہو کر علی گڑھ تشریف لائے اور بالائے قلعہ حافظ حسن خان صاحب کے مکان میں قیام پذیر ہوئے یہاں بھی مریدین و معتقدین کا ہجوم تھا۔ بلکہ وہ

مشتاقان زیارت جو بے خبری کی وجہ سے دھرم پورا ور سنڈول میں حاضری سے قاصر رہے تھے۔ اب جناب حضرت کی تشریف آوری کی شہرت سن کر پروانہ وار اتر ولی، ڈبائی، اونٹ گھر، چونڈیرہ، قادرے باغ وغیرہ سے آئے اور سلسلہ وارثیہ میں داخل ہوئے۔

چنانچہ تین روز علی گڑھ میں فیضان وارثی نے خلق اللہ کو مستفید فرمایا۔ جب حضور اقدس نے ہاترس جانے کا عزم کیا تو مجھ کو بھی رخصت فرمایا اور قدمبوس ہو کر میں پھر ایوں واپس آیا اور اسی مسجد میں آ کر پھر تنہا زندگی بسر کرنے لگا۔ البتہ اس دلچسپ سفر کی یاد شب تنہائی میں ضرور مونس وغمخوار تھی کہ حضور کے غیر معمولی تصرفات اور قابل یادگار واقعات کا خیال کرنے سے اکثر یہ حال ہوا کہ پہروں ساکت وصامت بیٹھا رہتا تھا۔

چنانچہ اس سفر کے بعد سے یہ حالت ہوگئی کہ آنکھوں کو کوئی سیر وتماشا پسند نہیں آتا تھا۔ ہر وقت وہی منظر پیش نظر تھا جو حضور کی بدولت دھرم پور کی سیاحت میں دیکھ آیا تھا۔ ہر چند بخیال دلبستگی بعض بزرگوں کی خدمت میں حاضر بھی ہوا مگر کسی صورت سے تسکین نہ ہوئی۔ بقول

شربت درد تو ہر خستہ کہ نوشید دمے
التفات بہ مسیحا و دم او نکند

﴿جو خستہ حال تیرا شربت پی لیتا ہے اسے مسیحا اور اس کے دم کی حاجت نہیں رہتی﴾

اسی انتظار میں دن رات زندگی بسر ہوتی تھی اور یہی خیالات اس قدر استوار ہو گئے تھے کہ کسی وقت دل کو قرار نہ تھا۔ مگر والد ماجد کا عرس قریب آ گیا تو حسب معمول اس کے انصرام میں مصروف ہوا اور بوجہ اس مرتبہ تاریخ معینہ میں بھی اس قدر ترمیم ہوئی کہ بجائے قمری مہینہ کے شمسی مہینہ اختیار کیا۔ چنانچہ ۱۳۱۹ ہجری کا عرس یکم چیت مطابق ۱۴ محرم سے شروع ہوا اور امداد غیبی سے ہر سال اس عرس میں کچھ نہ کچھ ترقی ضرور ہوئی اور اب یہاں تک شہرت بھی ہوگئی کہ بعض مشائخین بھی شریک ہونے لگے اور میرے اعزاء واحباب بھی دلچسپی لیتے تھے حتیٰ کہ اس عرس میں تین روز مہمانداری کے ساتھ قوالی بھی ہوئی اور ۳ چیت مطابق ۱۶ محرم کو یہ تقریب ختم ہوئی۔

اسی اثنا میں معلوم ہوا کہ نور محمد شاہ خادم خاص عہدہ خدمت سے معزول ہو گئے اور فیضو شاہ صاحب جو ماتحت تھے ان کے قائم مقام ہوئے اور سبب معزولی یہ ہوا کہ کچھ عرصہ سے وہ طامع اور حریص اسقدر ہو گئے تھے کہ ناگفتہ بہ ہے اور باوجود متواتر فہمائش کے اس خصلت

سے باز نہ آئے اور نہ یہ خیال کیا:

جہاں فانی و کارش جملہ فانی
چہ کار آید ترا گنج و خزانہ

﴿دنیا اور اس کے تمام کام ہا پائیدار ہیں تیرا خزانہ اور دولت کس کام آ سکتی ہے﴾

آخر ایک روز سرکار عالم پناہ نے فرمایا کہ دیکھو نور محمد شاہ یہ مشہور مقولہ ہے کہ یار سے دغا اور گرو سے چوری، یا ہوا ندھلایا ہو کوڑھی۔ مگر اس اسیر دام حرص و آز نے اس ہدایت کے بعد بھی اپنے اخلاق ذمیمہ کو درست کرنے کی کوشش نہ کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کا خون متحرک ہو گیا اور چہرہ پر تیج روز بروز بڑھنے لگا۔ اس وقت انھوں نے مجبوراً اپنے افعال قبیحہ سے توبہ کی اور شاید اسی شب کو یہ خواب دیکھا کہ سرکار عالم پناہ نے مجھ کو ایک دریا میں غوطہ دے کر نکالا تو جسم کی وہ سوزش اور تکلیف بھی جاتی رہی اور ہاتھ پاؤں کا ورم بھی اتر گیا۔

چنانچہ اس خواب کی بدیہی تعبیر بھی ظاہر ہو گئی کہ دو ہفتہ میں وہ احتراقی حالت معمولی علاج سے جاتی رہی لیکن پھر کچھ عرصہ کے بعد ''کاسہ چشم حریصان پر نشد'' کا مضمون صادق آیا نور محمد شاہ پھر نفس کے دام تزویر میں گرفتار ہوئے اور حسب عادت قدیم ان سے پھر وہی حرکات سرزد ہونے لگیں جن کی پاداش بھی فوراً ہو گئی اور چند ہی روز میں پھر وہی آزار رونما ہوا اور احتراقی مادہ عود کر آیا بلکہ اس مرتبہ کوئی علاج مفید نہ ہوا اور عارضہ میں روز بروز ایسی ترقی ہوئی کہ پاؤں کی انگلیاں شق ہو گئیں اور دونوں ہاتھ بھی خراب ہو گئے۔ بدنام بھی ہوئے اور مایہ ملی نہ رام بقول:

خیال جہاں از دلت دور کن
بکارت نیاید گہے حرص و آز

﴿دنیا کا خیال دل سے نکال دے، لالچ اور حرص وہوا کبھی کام نہیں آتے۔﴾

چونکہ یہ بھی معمول تھا کہ خادم خاص کھانا کھلانے میں شریک ہو اس حیثیت سے نور محمد شاہ روزمرہ دستر خوان بچھاتے تھے اور ہر ایک کھانے میں ان کا ہاتھ بھی لگتا تھا۔ یہ دیکھ کر دیگر خدام کو عموماً اور مرزا ابراہیم بیگ شیدا اور قاضی بخشش علی صاحب کو خاص طور پر بلحاظ بشریت خیال ہوا اور بہ نظر احتیاط چند مرتبہ جناب حضرت سے ملتمس ہوئے کہ دیگر خدمات اگر یہ انجام دیں تو ہم کو عذر نہیں لیکن کھانا کھلانے میں جو شریک ہوتے ہیں یہ ہم لوگوں سے نہیں دیکھا جاتا۔ ان کی تسکین کے واسطے کبھی تو جناب والا نے یہ فرمایا کہ عارضہ کو متعدی نہ خیال کرو

اور کبھی ارشاد ہوا کہ معمر شخص کو یہ عارضہ نہیں ہوتا اور کبھی ان کی دلجوئی اس طرح بھی کردی کہ فرمایا آیندہ سے کھانا کھلانے میں یہ شریک نہ ہوں گے لیکن اس حکم کا عمل درآمد نہ ہوا اور بدستور نور محمد شاہ اپنی خدمت پر مامور رہے۔

آخر ایک روز یہ دونوں غلام دست بستہ کھڑے ہوئے اور آبدیدہ ہوکر عرض کیا کہ حضور یہ درخواست منظور فرمائی جائے کہ نور محمد شاہ کل کام کریں۔ صرف دسترخوان کے قریب نہ آئیں۔ چونکہ یہ عرض داشت مشتمل بہ نفسانیت نہ تھی بلکہ عین محبت سے تھی اسلئے قبلہ عالم نے اسی وقت نور محمد شاہ کو نکال دیا۔ مگر ان کی خدمت کسی دوسرے خادم کو تفویض بھی نہیں فرمائی۔ تاہم یہ لوگ خوش ہو گئے اور نور محمد شاہ تمام دن بصورت مجرم باہر بیٹھے رہے۔

ناگاہ عصر کے وقت حکم ہوا کہ نور محمد شاہ کو بلالو۔ سب کو حیرت ہوئی اور ابھی بشکل ملزم جو باہر بیٹھے تھے وہ اندر آئے اور اپنا فرض منصبی ادا کرنے میں مصروف ہو گئے لیکن شیدا میاں اور قاضی صاحب کو یہ خیال ہوا کہ ہماری استدعا قطعی معزول کرنے کی نہ تھی۔ اسلئے دیگر خدمات کے واسطے بلائے گئے ہیں درخواست صرف اس قدر تھی کہ دسترخوان کے قریب نہ جائیں۔ وہ شاید منظور ہو گئی ہو اور اب کھانا کھلانے میں یہ شریک نہ ہو پائیں گے لیکن شب کو جب خاصہ آیا تو نور محمد شاہ نے حسب معمول کھانا کھلایا۔ یہ دیکھ کر شیدا میاں اور قاضی صاحب کو سخت تکلیف ہوئی مگر اس وقت بپاسِ ادب خاموش ہو رہے۔

یہ بھی قاعدہ تھا کہ شب کو بارگاہ وارثی میں علاوہ ہر دو خدام متعینہ کے ایک یا کبھی دو خادم اور بھی ضرور رہتے تھے جن کا کام یہ تھا کہ سرہانے بیٹھ کر کوئی تاریخی واقعہ بیان کریں یا حضور نے کوئی بات کی تو اس کا جواب دیں۔ گویا شب کے خادم یہی لوگ ہوتے تھے اور چونکہ روز و شب کی یہی خدمت تھی۔ اسلئے مزاج دانی بھی انھیں حضرات کا حصہ تھا اور اس خدمت روزانہ کیلئے تین چار ہی خادم مخصوص تھے۔ مجملہ ان کے شیدا میاں اور قاضی بخشش علی صاحب بھی تھے۔ اتفاق سے اس شب کو سرکار عالم پناہ نے انھیں دونوں کو حاضری کا حکم دیا۔ چنانچہ تمام رات نہایت مستعدی سے انھوں نے اپنی خدمت بھی انجام دی اور باہم یہ بھی تجویز کیا کہ صبح کو اس کا بھی قطعی تصفیہ کرلیا جائے کہ نور محمد شاہ ہرگز دسترخوان کے پاس نہ جائیں۔

صبح کو بھی یہ لوگ اپنی مقررہ خدمت میں مصروف رہے اور جب حضور ناشتہ کر چکے تو یہ دونوں غلام ہاتھ باندھ کر کھڑے ہوئے اور عرض کیا کہ ہم کو رخصت کردیا جائے۔ ارشاد ہوا: ''کہاں جاتے ہو؟'' عرض کیا: ''اپنے اپنے گھر'' فرمایا: ''کیوں جاتے ہو؟'' عرض

کیا: ''ہم سگ دنیا ہیں۔ باعتبار بشریت یہ نہیں دیکھ سکتے کہ جس کھانے کو مجذوم ہاتھ لگائے۔ اس کو آپ تناول فرمائیں۔ حالانکہ خود نور محمد شاہ کو احتیاط لازم تھی مگر خود غرضی سے وہ خیال نہیں کرتے اور نہ آپ ہماری استدعا منظور فرماتے ہیں۔ لہٰذا اب ہم کو تحمل نہیں۔ اسلئے مجبوراً اپنے اپنے گھر جاتے ہیں کہ نہ یہاں ہوں گے نہ ان کی یہ بدعنوانی دیکھیں گے۔''

سرکار عالم پناہ تھوڑا غور کرنے کے بعد کھڑے ہو گئے اور دونوں غلاموں کو سینہ سے لگالیا اور فرمایا: ''تم نے ہمارے واسطے دین و دنیا کو چھوڑا اور یہ بھی محبت کا تقاضا ہے جو کہتے ہو کہ وہ کھانا نہ کھلائیں۔ اچھا اب نہ کھلائیں گے۔'' اور فیضو شاہ سے ارشاد ہوا کہ تھیلا لے لو اور نور محمد شاہ کو ہٹا دو۔ چنانچہ فیضو شاہ نے فوراً اس حکم کی تعمیل کی۔

اس تھیلا میں حضور کا خاص اسباب رہتا تھا جس کی تفصیل یہ ہے کہ ایک کنگھا، ایک سرمہ دانی، ایک سلائی اور چند مٹی کے ڈھیلے اور سینک کے خلال اور ایک دو قسم کا چورن۔ یہی تھیلا جس خادم کے پاس ہو وہی خادم خاص کے لقب سے موسوم ہوتا تھا۔ چنانچہ اب تھیلا فیضو شاہ کو مل گیا لیکن معمولاً دوسرے خادم کی بھی ضرورت تھی جس کیلئے مختلف تجویزیں پیش ہوئیں۔

شاہ فضل حسین صاحب اور شیدا میاں نے یہ گذارش کی کہ اوگھٹ شاہ کو بلایا جاوے۔ سرکار نے فرمایا کہ وہ اپنے باپ کی قبر پر رہتا ہے اور یہاں کی زبان بھی وہ نہ سمجھے گا پھر ابوالحسن شاہ اور بگڑے دل شاہ کو تجویز کیا۔ حضور نے یہ رائے بھی ناپسند فرمائی۔

مگر فیضو شاہ چونکہ تنہا تھے اسلئے شیدا میاں و قاضی صاحب ان کے شریک رہے اور کچھ روز تک یونہی کام چلا۔ لیکن حضور نے دوسرا خادم کسی مصلحت سے مقرر نہیں فرمایا۔ خادم خاص صرف فیضو شاہ رہے اور دروازہ پر نعمت علی شاہ رہتے تھے۔ مگر کوئی مخصوص خدمت ان کو تفویض نہیں ہوئی تھی۔

اسی زمانہ میں شاہ فضل حسین صاحب نے یہ کل حالات ارقام فرمائے اور مجھ کو طلب کیا کہ خدمت میں رہو۔ میں نے جواب میں ممدوح کو نگارش کیا کہ اول تو بزرگوں کا فرمودہ ہے کہ: ''نزدیکاں رابیش بود حیرانی''۔ دوم سرکار عالم پناہ کی زبان اقدس سے سنا ہے کہ خدمت میں اندھا بنا کے رکھتے ہیں۔ لہٰذا میں خادم خاص ہونے سے ڈرتا ہوں اور ہمیشہ یہی استدعا ہے کہ جس طرح غلام بنایا ہے۔ اسی طرح غلام بنا کے رکھیں اور انشاء اللہ عنقریب زمانہ میلہ کاتک میں حاضر خدمت ہو کر اس کے متعلق زبانی عرض کروں گا۔

چنانچہ ۱۶ صفر ۱۳۲۰ ہجری کو میلہ کاتک میں حاضر ہوا تو یہ کرشمہ قدرت دیکھ کر حیرت

ہوئی کہ وہی نور محمد شاہ کل جن کا مزاج نہیں ملتا تھا۔ آج ایک تیلی کے یہاں پڑے ہیں اور اس قدر کسمپرسی کی حالت ہے کہ ان کا سلام کوئی نہیں لیتا۔ یہ انقلاب دیکھ کر میرا خیال اور مضبوط ہوگیا کہ واقعی خادم خاص بن کر خدمت کا فرض کماحقہٗ ادا کرنا بہت دشوار ہے لیکن وہ شوق روز افزوں تھا کہ دردولت پر حاضر ہوں۔ بلکہ اس مرتبہ رخصت ہوا تو پھر ایوں جانا شاق گزرا کہ ایک دن کا فراق بھی گوارا نہ تھا اور حسرت یہ تھی کہ صبح وشام آستانہ اقدس کی دید ہوتی اور عمر یونہی تمام ہو جاتی۔ بقول جامی علیہ الرحمۃ:

جز سر کویش من دیوانہ را مسکن مباد
بلبل بے خانماں راجائے جز گلشن مباد

﴿تیرے کوچے کے سوا دیوانے کا کوئی ٹھکانہ نہیں جس طرح بے گھر بلبل کو باغ کے علاوہ کہیں جگہ نہیں ملتی﴾

لیکن قربان جایئے کہ حضرت وارث پاک نے بندہ نوازی کی یہ شان دکھائی کہ ۱۳۲۰ھ میں شاہ ولایت صاحب کے عرس میں جب حاضر ہوا اور بدستور قدیم درگاہ میں قیام کیا تو چھ روز کے بعد جو میری رخصتی کا وقت تھا آقائے نامدار نے میرے حق میں یہ حکم صادر فرمایا کہ دردولت پر حاضر رہو۔ یہ منہ مانگی مراد پاکر بے حد مسرت ہوئی بقول

پایم نمیرسد بزمین دیگر از نشاط
تا سوئے من بلطف و عنایت تو دیدہ

﴿آپ نے مجھ پر لطف وکرم کی نگاہ ڈالی ہے میرے پاؤں زمین پر نہیں ٹکتے۔﴾

اسی کے ساتھ یہ حکم ہوا کہ بستر بھی دردولت پر لگاؤ۔ چنانچہ اسی روز صدر دروازہ کے قریب پہلی ڈیوڑھی میں بستر بچھایا جس کے جنوبی سمت جو کمرہ تھا اس میں رحیم شاہ صاحب رہتے تھے اور میرے بستر کے پائیں شمال کی طرف نعمت علی شاہ کا بستر تھا۔ اب کوئی غم نہ رہا اور اطمینان ہوگیا کہ

دی جگہ در پہ شاہ وارث نے
ورنہ اوگھٹ کہاں ٹھکانا تھا

پہلے مجھ کو خدمت مہمان نوازی مرحمت ہوئی کہ زائرین کے قیام اور ان کے آرام کا انتظام کروں۔ ان کی آسائش کیلئے روشنی اور پانی وغیرہ موجود رہے۔ صبح وشام ان کو کھانا پہنچاؤں اور جو ارادتمند حلقہ غلامی میں داخل ہو اس کو خدمت والا میں پیش کروں لیکن دو ہفتہ کے

بعد مساکین کو روزانہ جو خلہ تقسیم ہوتا تھا اس کا انصرام بھی مجھ کو تفویض ہوا اور اب تمام دن انھیں خدمات میں مصروف رہنے لگا اور اپنی قسمت پر خود ناز کرتا تھا۔ بقول:

خاک قدم دوست شدم نیست کسے را
این عیش کہ امروز مرا در قدم اوست

﴿آج میرا عیش آرام اس کے قدموں کی برکت سے ہے میں اپنے دوست کے قدموں کی خاک ہوں اور کسی کیلئے اس سے ماسوا کچھ نہیں﴾

ایک روز پانی برسا تھا اور ابر کی وجہ سے رات کو تاریکی زیادہ تھی اور مہمانوں کو آمد و رفت میں بہت تکلیف ہوئی کیونکہ صحن دولت سرائے میں اور صدر دروازے کے باہر روشنی کا قطعی انتظام نہ تھا۔ دوسرے روز جب اس کی شکایت حضور نے سنی تو یہ خدمت بھی مجھ فقیر کو مرحمت ہوئی۔ میں نے پہلا کام یہ کیا کہ ایک چوبی ستون لالٹین کے واسطے صحن مکان میں اور ایک صدر دروازہ کے باہر پائخانہ کے قریب اس انداز سے گاڑا جس کی روشنی ہر چہار جانب ہو اور ان پر لالٹین نصب کردی۔ رات کو جب انھیں روشن کیا تو سب کو یہ انتظام پسند آیا مگر فیضو شاہ صاحب کو یہ روشنی شاید خوشگوار نہ معلوم ہوئی یا کسی اور وجہ سے جناب والا کی خدمت عالی میں عرض کیا کہ جو بات کبھی نہ ہوئی تھی وہ شروع کی گئی اور جدید منتظم نے لالٹین لگائی ہے۔ حضور نے مجھ کو بلا کر دریافت کیا۔ میں نے اس کی ضرورت ظاہر کی اور صحن مکان میں جو لالٹین روشن تھی وہ دکھائی۔ چونکہ اس وقت خفیف بارش ہو رہی تھی اور ابر غلیظ تھا۔ اس تاریکی میں وہ روشنی نہایت خوشنما معلوم ہوتی تھی۔ حضور نے فرمایا: ''یہ تمھاری ایجاد ہے؟'' میں نے عرض کیا کہ ایک لالٹین باہر بھی لگائی ہے۔ فرمایا: ''چلو اس کو بھی دیکھیں۔ ہر چند خدام نے بارش کا عذر کیا مگر قبلہ عالم صدر دروازہ تک تشریف لائے اور باہر کی لالٹین دیکھ کر ارشاد ہوا: ''اب مہمانوں کو بہت آرام ملے گا۔''

الغرض جب سرکار عالم پناہ کی منظوری ہوگئی تو پھر کسی خادم نے روشنی کی نسبت کبھی اعتراض نہیں کیا اور میں وقت اور موقع کے لحاظ سے جہاں اور جس قدر روشنی کی ضرورت دیکھتا تھا اس کا انتظام کرتا تھا۔

ایک روز قبلہ عالم نے مجھ سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ خطوط لائے؟ میں نے عرض کیا کہ ہرپرشاد چٹھی رسان لاتا ہے وہ ابھی آیا نہیں۔ ارشاد ہوا: ''تم ڈاکخانہ جا کر لاؤ۔ میں فوراً گیا اور حضور کے نام جس قدر خطوط آئے تھے لا کر خدمت والا میں پیش کئے۔ جناب حضرت

بیٹھ گئے اور خطوط لیکر فرمایا: ''اتنے خط آئے ہیں۔''

چونکہ اس زمانہ میں ظہور اشرف میاں چٹھی رسان سے خطوط لے کر بے ترتیب طریقہ سے ان کا مفہوم سنا دیا کرتے تھے۔ اسی خیال سے وہ بھی آئے اور خطوط لینا چاہے۔ مگر سرکار عالم پناہ نے بجائے ان کے خطوط میرے ہاتھ میں دے دیئے اور ایک خط ملاحظہ فرمانے لگے۔

اس روز سے یہ خدمت بھی مجھ کو نصیب ہوئی کہ روزانہ ڈاکخانہ سے خطوط لاکر خدمت والا میں پیش کرتا تھا اور جس خط کے جواب میں جو ارشاد ہوتا تھا وہ لکھ دیا کرتا تھا۔ عرصہ تک تو یہی صورت رہی۔ مگر پھر حضور نے فرمایا: ''تم پڑھ کر خلاصہ اس کا سنا دیا کرو کہ کس کا خط ہے اور کیا مضمون ہے'' چنانچہ کچھ روز یہ طریقہ رہا کہ مفہوم خط سن کر جو جواب میں ارشاد ہوا وہ لکھ دیا کرتا تھا لیکن بعد کو یہ قاعدہ بھی عارضی ثابت ہوا۔ کیونکہ پھر مضمون سنکر یہ فرماتے تھے کہ جواب لکھ دو۔ میں جواب لکھ کر سنا دیا کرتا تھا۔

چونکہ عموماً خدام کا یہی کام تھا کہ ہمہ وقت حضور کی طبیعت بہلانے کی کوشش کرتے تھے اور اگر کسی کی باتوں پر یا کوئی دلچسپی کا سامان کسی نے ایسا پیش کیا کہ قبلہ عالم نے تبسم فرمایا تو اس آن واحد کے مسکرانے کو وہ خادم اپنی عین کامیابی اور سرمایہ فخر ومباہات سمجھتا تھا جو محبت کا خاص تقاضا ہے اسی خیال سے میرا بھی یہ معمول تھا کہ شب کو جناب والا جب خاصہ نوش فرماتے تھے تو شمع دان لیکر سامنے حاضر رہتا تھا اور بعض مجاذیب کا تذکرہ یا قلندرانہ مذاق کے جملے عرض کرتا تھا تا کہ حضور محظوظ ہوں اور دو لقمہ زیادہ تناول فرمائیں کیونکہ غذا آپ نے بہت کم کر دی تھی اور ضعف سے چلنے میں پاؤں کو لغزش ہوتی تھی۔

میں نے یہ بھی اختیار کیا تھا کہ ایک بجے دن کو چونکہ اکثر تخلیہ رہتا تھا اس وقت سرکار عالم پناہ کی دلبستگی کے واسطے مشائخین عظام کا عاشقانہ کلام سناتا تھا۔ چنانچہ ایک روز والد مرحوم کی غزل جس کا مطلع یہ ہے:

ما کافر عشقیم دگر کار نہ داریم
از کفر و ز اسلام سروکار نہ داریم

﴿میں کافر عشق ہوں اور اس کے سوا مجھے کچھ کام نہیں اور کفر و اسلام کچھ سروکار نہیں رکھتا﴾

پڑھنا شروع کی تو حضور نے پہلا شعر سن کر اپنا دست مبارک بلند کیا اور فرمایا کہ یہ کس کی غزل ہے؟ عرض کیا کہ والد مرحوم نے لکھی تھی۔ ارشاد ہوا: ''وہ فقیر تھے۔''

لیکن خواجہ امیر خسرو علیہ الرحمتہ کا کلام حضور کو زیادہ پسند تھا۔ بلکہ اکثر یہ بھی ارشاد ہوا ہے کہ ''مرید ہو تو ایسا ہو۔'' جیسے امیر خسرو اپنے پیر کے مرید صادق تھے مگر پیر کو بھی لازم ہے کہ ایسے خلوص و محبت سے مرید کی نگرانی کرے کہ مابین پیر و مرید حجاب غیریت نہ رہے اور باہم اتحاد بلکہ عینیت ہو جائے کیونکہ پیر و مرشد کا رشتہ ایسا ہے جیسے باپ اور بیٹا یا استاد اور شاگرد۔ یا شوہر اور بیوی جو متحد اور باہم خیر اندیش ہوتے ہیں۔ یہی صورت پیر و مرید کی ہے۔ پیر کی عنایت و شفقت ہی سے مرید کے دل میں اطاعت و محبت کا مادہ پیدا ہوتا ہے اور بالآخر یہی اطاعت و محبت اس کو فائز المرام کرتی ہے۔

پیر و مرید کو اگر باپ اور بیٹا قیاس کیا جائے تو اسی کے ساتھ یہ بھی سمجھو کہ وہ مجازی باپ ہے اور پیر روحانی باپ ہے۔ وہ جسمانی نشو نما کے واسطے اگر لذیذ غذائیں کھلاتا ہے تو یہ روحانی عروج و ترقی کیلئے نعمائے معنوی سے پرورش کرتا ہے وہ ہر وقت اگر امراض جسمانی سے محفوظ رکھتا ہے تو یہ ہر آن اغوائے شیطانی سے نگہداشت کرتا ہے۔ بیٹا اپنے باپ کے اموال ظاہری کا مالک ہوتا ہے۔ مرید اپنے پیر کے علوم باطنی کا مستحق ہے جس طرح بیٹا اپنے باپ کی نشانی ہے اسی طرح مرید اپنے پیر کی زندہ یادگار ہے۔

اور اگر پیر کو بجائے استاد اور مرید کو بمنزلہ شاگرد تصور کرو تو یہ تمثیل بھی صادق آتی ہے کہ استاد اپنے فنون سفینہ سے شاگرد کو فائدہ پہنچاتا ہے اور پیر علوم سینہ کے فیوض و برکات تفویض فرماتا ہے۔ یہ استاد مجازی ہے جو شاگرد کو علوم ظاہری سے ماہر کرتا ہے اور پیر چونکہ معلم حقیقی ہے وہ مرید کو معنوی تربیت سے شائستہ بناتا ہے۔ جس طرح مجازی استاد کی تعلیم سے مختلف لغات معلوم ہوتے ہیں اسی طرح حقیقی معلم کی توجہ نکات حقیقت اور رموز معرفت سے آگاہ کرتی ہے۔ مجازی استاد کی عنایت سے شاگرد روشن خیال ہوتا ہے۔ حقیقی استاد کی ہدایت سے مرید کا مکدر قلب نورانی ہوتا ہے۔ استاد بھی اپنے شاگرد کی نگرانی کرتا ہے اور پیر بھی اپنے مرید کا معاون و دستگیر رہتا ہے۔

دست پیر از غائبان کوتاہ نیست
دست او جز قبضہ اللہ نیست

﴿پیر و مرشد کا ہاتھ غائبین (مردان غیب) سے چھوٹا نہیں اور اس کے ہاتھ پر اللہ کا قبضہ ہے﴾

علی ہذا زن و شوہر کا اتحاد اور پیر و مرید کا تعلق بھی تقریباً یکساں اور بہت مشابہ معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح باہم میاں اور بیوی ہم راز ہوتے ہیں۔ اسی طرح پیر مرید کی حالت سے

خبردار اور مرید پیر کا رازدار رہتا ہے۔ بلکہ ظاہر ہے کہ جب تک زن وشوہر میں حجاب رہتا ہے۔ نکاح کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ وہی صورت پیر ومرید کے تعلقات کی ہے کہ جب تک مرید محجوب ہے۔ پیر کے فیوض وبرکات سے مستفید نہیں ہوسکتا اور یہ حجاب درحقیقت خود پرستی کا نام ہے۔ البتہ اس حجاب غیریت کو صرف محبت کا ہاتھ اٹھا سکتا ہے اور جب یہ حجاب اٹھ جاتا ہے تو مرید کو تصدیق ہو جاتی ہے اور جوش وجد میں زبان حال سے کہتا ہے:

ما کہ ازعین الیقیں حق الیقیں رادیدہ ایم
از دلیل ظنی وتشکیک برہان فارغیم

﴿میں نے یقین کی آنکھ سے یقینی حق کو دیکھا ہے اس لئے میں ہر قسم کے شکوک وشبہات اور دلائل براہین سے فارغ ہوں﴾

اور یہ تو مسلمہ ہے کہ محبت کا نتیجہ آخر عینیت ہے جس کی شہادت خواجہ امیر خسرو کی حالت سے بخوبی ملتی ہے کہ صرف ان کے خلوص نے ان کو اس مرتبہ پر پہنچایا کہ آج پیر پرست ہونے کا مخصوص شرف بھی ان کو حاصل ہے اور مرید صادق کا ممتاز خطاب بھی ان کے نام نامی کے ساتھ ضم ہے لیکن

این سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

﴿یہ سعادت وخوش بختی بزور طاقت حاصل نہیں کی جاسکتی اور یہ اللہ کے لطف وکرم سے ہی ملتی ہے۔﴾

ایک روز خدمات مقررہ کی انجام دہی میں مشغول تھا کہ حضور نے مجھ کو دیکھا اور ازراہ بندہ نوازی فرمایا کہ: ''تم اپنے والد کا عرس کراؤ۔'' میں نے بکمال ادب عرض کیا کہ ابتدا سے میرا یہ خیال تھا کہ جب تک پچھرایوں میں رہوں گا عرس بھی کروں گا چونکہ اب میرا قیام وہاں نہیں ہے اسلئے عرس کے انتظام سے بھی مجھ کو کوئی تعلق نہ ہونا چاہیے۔ لیکن حضور نے مکرر فرمایا: ''نہیں وہ فقیر تھے۔ جاؤ اور عرس کا انتظام کرو'' اور خادم خاص سے ارشاد ہوا: ''چھپی ہوئی چادر ہو تو لاؤ۔'' فیضو شاہ نے چند چادریں پیش کیں۔ جناب والا نے تین چادریں جن میں دو گلابی اور ایک بیجنی رنگ کی تھی یہ فرما کر مجھ کو مرحمت فرمائیں کہ ''ہماری طرف سے چڑھا دینا'' چنانچہ ۱۷ ذیقعدہ کو میں دیوئی شریف سے روانہ ہوا اور پچھرایوں پہنچ کر عرس کا انتظام شروع کر دیا اور حسب معمول ۱۴ ذی الحجہ کو افتتاح عرس کے روز ایک گلابی چادر سہراب شاہ کے

مزار پر اور بیچنی چادر والد کے مزار پر چڑھادی مگر ایک گلابی چادر باقی رہ گئی کیونکہ اس وقت تک دو ہی مزار تھے۔ تاہم وہ چادر اس خیال سے میں نے محفوظ رکھی کہ یہ بے کار نہیں آئی ہے ضرور اس میں کوئی راز مستتر ہوگا۔

پیشوائے برحق کی امداد سے یہ عرس بھی نہایت خوبی کے ساتھ ہوگیا بلکہ گذشتہ عرس کے اعتبار سے کسی قدر انتظام زائد کرنا ہوا کیونکہ مہمان بھی زیادہ آئے اور اہل قصبہ نے بھی غیر معمولی دلچسپی لی۔ چنانچہ ۱۶ ذی الحجہ کو قل ہوا اور ۲۰ ذی الحجہ کو میں دیوبی شریف واپس آیا اور بدستور اپنے فرائض منصبی ادا کرنے میں مصروف ہوگیا۔

لیکن اتفاق سے ۲۸ جمادی الاولی ۱۳۲۱ ہجری کو بضرورت ایک ہفتہ کے واسطے پھر ایوں پھر آیا تو حافظ علی بخش صاحب نے جو مسجد سہراب شاہ کے قریب رہتے تھے۔ اپنا یہ خواب مجھ سے بیان کیا کہ ایک شب کو میں نے دیکھا کہ احاطہ کی شرقی دیوار افتادہ کی طرف سے مسجد میں آنا چاہتا ہوں تو مجھ کو یہ کرشمہ نظر آیا کہ ہر دو مزار کے مابین پکھریا کے درخت کے نیچے ایک درویش تہبند پوش اور گیسو دراز شیر کا تکیہ لگائے بیٹھے ہیں۔ وہ شیر مجھ کو دیکھ کر حملہ آور ہوا تو میں بھاگا اور پھر دروازہ کی جانب سے آنے کا قصد کیا تو دیکھا کہ وہی شاہ صاحب اسی ہیئت سے صحن مسجد میں تشریف رکھتے ہیں اس وقت میں نے آپ کو پکارا اور آپ مسجد سے باہر آئے تو وہ شیر بھی اور شاہ صاحب بھی اسی درخت کے نیچے روپوش ہوگئے اور آپ نے کہا کہ ڈرو نہیں یہ شاہ صاحب کا مزار ہے اور شیر ان کی سواری کا ہے۔

یہ خواب سنکر دوسرے روز اسی مقام پر قریب ایک گز عمیق کھدوایا تو ایک قبر نظر آئی۔ میں نے اسی وقت نانا چودھری حبیب اللہ خان صاحب اور ماموں حاجی اشفاق حسین خان صاحب اور بھائی چودھری ظفر الدین خانصاحب اور ماموں چودھری حافظ عبدالمجید خانصاحب کو بلا کر وہ قبر دکھائی اور مشورہ کیا تو سب نے بالاتفاق کہا کہ اس کو بلند کر کے بنوا دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ مولوی قیام الدین صاحب کے خرچ سے وہ قبر بھی بلند کرادی اور تینوں قبروں کے چہار جانب پختہ چبوترہ بنوادیا اور اس وقت وہ تیسری چادر جو میرے پاس محفوظ تھی اس نو برآمد قبر پر چڑھادی اور معلوم ہوا کہ اس میں یہ راز مضمر تھا کہ جو قبر ہماری آنکھوں سے پوشیدہ تھی۔ وہ حضور کے پیش نظر تھی۔ بقول حافظ علیہ الرحمۃ:

مصلحت نیست کہ از پردہ برون افتد راز
ورنہ در مجلس شاہان خبرے نیست کہ نیست

﴿راز آشکار کرنا قرین مصلحت نہیں ورنہ ان شاہوں کی محفل میں ''نہیں'' کسی چیز کا نام نہیں یعنی انھیں ہر بات پر دسترس ہے۔﴾

بعد کو دیگر ذرائع سے معلوم ہوا کہ ہر چند سہراب شاہ قادریہ سلسلہ کے درویش اور رحمت اللہ شاہ صاحب کے مرید تھے لیکن ان کے سلسلہ چشتیہ کے پیر طریقت کا یہی مزار ہے اور یہ مسجد بھی انہیں کی ساختہ ہے۔

الحاصل ۶ جمادی الثانی کو دیوئی شریف میں حاضر ہو کر شرف قدمبوسی سے مشرف ہوا اور جدید قبر کا ظاہر ہونا بھی خدمت والا میں عرض کیا اور چند ماہ کے بعد اس سال کے عرس کا انتظام بھی اسی طریق سے کیا کہ حسب اجازت جناب حضرت ۴ ذیقعدہ کو بچھرایوں گیا اور بعد اختتام عرس ۱۹ ذی الحجہ کو دیوئی شریف واپس آ گیا۔

علی ہذا اسی عرس کے سلسلہ میں ۱۳ ذی الحجہ ۱۳۲۲ ہجری کو پھر بچھرایوں گیا اور حسب دستور ۱۴ محرم سے عرس شروع ہو کر ۱۶ تاریخ کو ختم ہوا اور ۱۸ تاریخ کو معہ چند اعزاء اور ان کی مستورات کے بچھرایوں سے روانہ ہو کر ۱۹ محرم کو دیوئی شریف میں جس وقت پہنچا اور خدمت بابرکت میں حاضر ہوا تو دیکھا کہ زکام کی وجہ سے گونہ حرارت اور کسی قدر آواز بھاری ہے۔ ہر چند یہ شکایت ایسی نہ تھی کہ باعث تردد ہو مگر خدام کو غیر معمولی طور پر متفکر پایا تو مجھ کو بھی یہ خیال ہوا کہ مزاج ناساز ہے۔ مہمانوں کو قدمبوسی کا موقع بہت کم ملے گا اور خصوصاً عورتوں کی حاضری تو یقینی دشوار ہوگی ۔ اسلئے جو میرے ہمراہ آئے ہیں ان کا جلد سے جلد واپس جانا مناسب ہے چنانچہ دوسرے روز سب کو رخصت کرا دیا۔

چونکہ شیدا میاں بھی بغرض شرکت عرس بچھرایوں گئے تھے۔ اس لحاظ سے حضور نے مجھ سے دریافت فرمایا کہ۔ ''شیدا کہاں ہیں'' عرض کیا کہ وہ لکھنو میں ٹھہر گئے ۔ ارشاد ہوا کہ ''تار دیکر بلالو'' حسب الحکم اسی وقت تار دیا اور اور رات کی گاڑی سے شیدا میاں بھی نہایت متوحش اور منتشر آئے اور تپ میں ترقی دیکھی تو ۲۱ محرم کو مختلف مقامات پر علالت کی اطلاع بذریعہ تار دی گئی اور ۲۲ سے ۲۳ تک پٹنہ سے مولوی محمد یحییٰ صاحب اور جسٹس سید شرف الدین ، دھرم پور سے نواب عبدالشکور خان صاحب، بیگرہ سے بابو کنیالال صاحب اور حافظ حسن خان صاحب، ضلع سلطان پور سے راجہ دوست محمد خان صاحب، زمانیہ سے حاجی وصی الزمان خان صاحب آ گئے اور علاوہ ان کے جس کو معلوم ہوا کہ حضور کا مزاج ناساز ہے وہ فوراً حاضر ہوا۔ چنانچہ دو روز میں در دولت پر غلامان وارثی کا ہجوم ہو گیا اور سب کی متفقہ رائے سے ۲۳ محرم

کو حکیم عبدالعزیز صاحب لکھنو سے بلائے گئے اور باقاعدہ علاج شروع ہوا۔

حکیم صاحب نے ذات الجنب تجویز کیا اور ایک نسخہ خیساندہ کا اور ایک قیروطی کا لکھا جس کو نواب عبدالشکور خان صاحب نے اپنی نگرانی میں اسی وقت تیار کرایا اور دو ساز متعین کئے بلکہ ہر ایک نسخہ بکمال احتیاط اپنے سامنے بنواتے تھے اور یہ سعادت انھیں کو نصیب ہوئی کہ آخر وقت تک اس خدمت کو جناب موصوف نے انجام دیا۔

لیکن باوجودیکہ بروقت خیساندہ بھی استعمال ہوا اور قیروطی کی متواتر مالش بھی کی گئی ۔مگر کسی قسم کا فائدہ محسوس نہ ہوا بلکہ ۲۴ تاریخ کو جب بجائے افاقہ کے مرض میں ترقی دیکھی اور ضعف بھی زیادہ ہوگیا۔اس وقت حکیم صاحب نے نہایت غور وفکر کے ساتھ نسخہ میں کافی ترمیم کی اور تقویت کے واسطے سہ پہر کو جواہر مہرہ معتدل بھی کھلایا۔مگر شب کو تپ بدستور رہی اور اخراج بلغم میں بھی کوئی آسانی نہ ہوئی حتیٰ کہ ۲۵ تاریخ کو بھی شدائد مرض بدستور رہے تو حکیم صاحب نے خیساندہ کا نسخہ جدید لکھا اور مختلف طور پر خارجی تدبیریں بھی کیں: ''مگر روغن بادام خشکی می نمود'' کا مضمون پیش آیا کہ بجائے فائدہ کے مرض بڑھتا گیا۔

۲۶ محرم کو مریدین ومعتقدین کا در دولت پر اژدھام تھا اور اس مجمع میں چونکہ ہر طبقہ کے لوگ تھے جن میں دس پانچ مقتدر طبیب بھی تھے۔ان کی رائے یہ ہوئی کہ حکیم عبدالعزیز صاحب حاذق اور تجربہ کار طبیب ضرور ہیں لیکن چار روز کے مسلسل علاج سے جب کوئی افاقہ محسوس نہیں ہوتا بلکہ روز بروز شدائد مرض میں ترقی ہے اور جس رفتار سے ضعف بڑھ رہا ہے اس کو خطرناک کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔اسلئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اب دوسرے طبیب سے رجوع کیا جائے ورنہ خدانخواستہ حرارت غریزی میں آئندہ انحطاط ہوا تو پھر اس کا بھی موقع نہ رہے گا۔

چنانچہ دیگر مقتدر حضرات نے بھی اس رائے کو پسند کیا اور بالآخر خواجگان ملت نے یہ تجویز کیا کہ حکیم عبدالحئی صاحب رئیس قصبہ مہوا جو نہایت قابل طبیب ہیں اور بلحاظ عقیدت جناب والا کی عیادت کے واسطے حاضر بھی ہوئے ہیں۔ان کا علاج کیا جائے۔

الغرض اسی وقت سے علاج تبدیل ہوا۔غلامان وارثی نے بکمال شکرگزاری حکیم عبدالعزیز صاحب کو رخصت کیا اور حکیم عبدالحئی صاحب نے اس احتیاط سے نسخہ مرتب کیا کہ وہ غلامان وارثی جن کو فن طب میں کافی دسترس تھی اور اپنے اپنے وطن میں مشہور طبیب تھے ان کو بھی شریک کیا اور ہر امر میں ان سے مشورہ کیا اور دوا بھی اپنے ہاتھ سے تیار کی جس کے استعمال سے

گونہ سکون اسی روز ہوا اور ۲۸ تاریخ کو تو خلاف امید اسقدر افاقہ ہوگیا کہ تپ بھی بہت خفیف آئی اور بلغم بھی بآسانی خارج ہوا یہ دیکھ کر جملہ حلقہ بگوش مسرت کے جوش میں سجدہ شکر بجالائے اور امید ہوئی کہ اب صحت میں ترقی ہوگی۔

اس دوران میں جس طریق سے علاج میں اہتمام بلیغ تھا اسی صورت سے اس کی بھی کامل احتیاط تھی کہ حضور کے گرد و پیش بجز خدام اور تیمارداروں کے عام لوگ مجتمع نہ ہوں اور تیماردار بھی زیادہ بلند آواز سے باتیں نہ کریں جو درحقیقت مخل آسائش اور باعث تکلیف ہوتی ہیں۔ بدیں وجہ یہ انتظام تھا کہ عام طور پر لوگ حاضر نہیں ہو سکتے تھے اور دوروز سے درد دولت پر اہل ارادت شوق زیارت میں بے چین تھے لیکن مزاج ہمایوں سے اس افاقہ اور سکون سے ان کو یہ موقع مل گیا کہ خدمت بابرکت میں حاضر ہو کر حلقۂ غلامی میں داخل ہونے لگے۔

اسی اثنا میں ایک شخص درہ خیبر (افغانستان) کا باشندہ نہایت مضطر و بیقرار حضور کی خدمت میں پروانہ وار حاضر ہوا۔ بقول

عاشقان سوئے حضرتش بدمست
عقل در آستین و جان بردست

﴿عاشق ان کی جانب کچھ اس کیف و مستی اور جذب سے جاتے ہیں کہ عقل کو نظر انداز کر کے جان ہتھیلی پر دھر لیتے ہیں۔﴾

اور آبدیدہ ہو کر زبان پشتو میں کچھ عرض کیا جناب حضرت نے اس طالب صادق کو تہبند فقر مرحمت فرمایا اور ارشاد خطاب عطا ہوا اور ارشاد ہوا: ''جاؤ۔ سیر کرو، دوسری صورت نہ دیکھنا۔'' اس حق نیوش نے حالت وجد و جوش میں قدمبوس ہو کر عرض کیا:

چگونہ شکر توان گفتن این کرامت را
کہ خلعت شہ عالم بدین گدا برسد

﴿آپ کی اس کرامت کا شکر یہ کیسے ادا کروں کہ شاہ عالم کی خلعت فاخرہ اس فقیر تک پہنچی ہے۔﴾

قدیم خدام سے معلوم ہو کہ پہلے بھی یہ طالب راہ فقر حاضر ہوا تھا اور تعلقات دنیا سے دست بردار ہونا چاہتا تھا جناب حضرت نے اس کی بیعت تو لی۔ مگر خرقہ کی نسبت یہ فرما کر رخصت کر دیا تھا کہ ''ابھی جاؤ تین برس کے بعد آنا۔ اس وقت تہبند بھی دینگے۔'' چنانچہ وہ سہ سالہ مدت اب ختم ہوئی تھی کہ وہ خدا شناس پھر حاضر ہوا اور ہمارے صادق الاقرار پیشوا نے اپنا

وعدہ وفا کیا کہ خلعت فقر اور خطاب شاہی مرحمت فرما کر اس کو فائز المرام کر دیا۔

ہر چند اس افغانی کی پہلی حاضری کے واقعات بھی عجیب وغریب ضرور ہیں لیکن بخوف طوالت ان کو چھوڑ کر اسی قدر عرض کرتا ہوں کہ اس باخبر اور ذی ہوش تہبند پوش کا ایک غیر معمولی واقعہ یہ ہے کہ جب خرقہ وارثی پہن کر چلا تو پہلے دروازہ تک جاتے ہر شخص نے دیکھا مگر صدر دروازہ پر گو متعدد حضرات موجود تھے اور بستی میں اور بستی کے باہر اسٹیشن تک آیند و روند کا سلسلہ ایسا تھا کہ تا علالت کسی وقت بند نہ ہوا مگر یہ تہبند پوش نہ در دولت پر کسی سے ملا اور نہ بستی میں کسی سے ملاقات ہوئی اور نہ راستہ میں اسٹیشن تک کسی نے اسکو دیکھا۔ بلکہ ہنوز یہ نہیں معلوم ہوا کہ یہ سیاح زندہ اور کہیں مقیم بھی ہے یا جان بحق تسلیم ہوا۔ چنانچہ سعدی علیہ الرحمۃ کا یہ شعر کس قدر اس مفقود الخبر کے حسب حال ہے۔

این مدعیان در طلبش بیخبرانند
کانرا کہ خبر شد خبرش باز نہ آمد

﴿یہ طالب اپنی طلب میں کچھ اس طرح مخلص ہیں کہ جسے کچھ خبر ملتی ہے پھر کسی کو اس کا پتا نہیں ملتا۔﴾

۲۹ محرم کو بھی حکیم عبدالحی صاحب کا وہی نسخہ دیا گیا اور جناب والا کی طبیعت چونکہ بشاش دیکھی تو اکثر اہل ارادت حاضر خدمت ہوئے اور راہنمائے برحق نے ان کی حمایت اور دستگیری فرمائی۔ ناگاہ ایک معمر سادھو نانک شاہی بھی حاضر ہوئے اور قدمبوس ہو کر سنسکرت میں شاید کوئی اشلوک پڑھا جس کے اثر سے خود مکیف ہو گئے۔

چنانچہ جناب والا نے باوجود اس ضعف ونقاہت کے اس طالب صادق کو اقرار توحید اور تلقین استغفار کے بعد اپنے سلسلہ میں داخل کیا اور پوچھا کہ تمھارا کیا نام ہے؟ سادھو جی نے عرض کیا: اے مرشد ذی اساس اس بے بضاعت فقیر کو نیم داس کہتے ہیں لیکن یہ لقب تو مجازی ہے حقیقی نام اس ناچیز غلام کا وہی ہوگا جو حضور تجویز فرمائیں گے بقول:

بندہ را نام خویشتن نبود
ہر چہ مارا لقب کنی آنیم

﴿بندے کا اپنا کوئی نام نہیں جو لقب آپ مجھے دیں گے میں وہی ہوں۔﴾

جناب حضرت نے اس حق شناس کی حالت پر مزید عنایت فرمائی کہ علاوہ واردات قلبی کے اس کے ظاہری لباس میں بھی تبدیلی منظور ہوئی۔ خادم خاص سے ارشاد ہوا کہ ''تہبند

اورلنگوٹ بھی ان کو دیدو" اورنہایت ضعیف آواز سے اس عاشق جانباز کو یہ ہدایت فرمائی کہ اب تمھارا امام رسول شاہ ہے۔ دنیا کے واسطے کوئی کام نہ کرنا اورخدا کی محبت میں جان دینا"۔ چنانچہ اسی سال طلب الٰہی میں رسول شاہ صاحب مکہ معظمہ گئے اور حج بیت اللہ سے مستفیض ہوئے بقول:

مور مسکین ہوسے داشت کہ درکعبہ رسد
دست در پائے کبوتر زد ناگاہ رسد

﴿بے چاری چیونٹی کعبہ جانے کی آرزومند تھی وہ کبوتر کے پیروں سے لپٹ گئی اورچشم زدن میں وہاں جا پہنچی﴾

بلکہ بعد ادائے حج مدینہ منورہ کے راستہ میں ان کو یہ سعادت نصیب ہوئی کہ وصل یار کی جستجو میں اس دارفانی سے ملک جاودانی کو روانہ ہوئے۔ سبحان اللہ! ایک ساعت کے فیضان صحبت نے خاک سے پاک کردیا۔ جواریار میں مسکن گزین ہوئے۔ حیات ابدی پائی۔ بیڑا پار ہوگیا۔ سچ ہے بقول سعدی علیہ رحمۃ:

دست در دامن مردان زن واندیشہ مکن
ہرکہ بانوح نشیند چہ غم از طوفانش

﴿ہاتھ میں مرد کا دامن تھام لے اورکوئی اندیشہ مت کر جوکوئی سفینۂ نوح میں سوار ہوا سے طوفان سے ڈرنے کی کیا ضرورت ہے۔﴾

علی ہذا اورمتعدد ارادتمند بھی خدمت بابرکت میں حاضر ہوئے اوران کو بھی جناب حضرت نے داخل سلسلہ فرمایا لیکن بعد زوال حضور کی طبیعت پھر مضمحل اورنڈھال ہوگئی۔ حکیم صاحب نے دیگر تدابیر سے اشتداد تپ کو روکنا چاہا مگران کی کوئی کوشش مؤثر نہ ہوئی اور تمام شب مزاج بدستور ناساز رہا۔ ۳۰ تاریخ کو بدستور صبح کے خیساندہ کے ساتھ بعض مفرحات کا بھی استعمال ہوا مگر جب کوئی فکر سودمند نہ ہوئی تو حکیم صاحب مایوس ہوگئے اور کہنے لگے کہ طبیعت اسقدر ضعیف ہے کہ دوا اپنا فعل نہیں کرتی۔

اس عرصہ میں حکیم نصیر الدین صاحب وارثی متوطن انا وہ نے نہایت پر جوش الفاظ میں جملہ حاضرین سے مخاطب ہوکر یہ کہا کہ شام سے میں یہاں حاضر ہوں اور بار بار یہ خیال گزرتا ہے کہ میں نے فن طب کس دن کیلئے حاصل کیا ہے۔ اگر آج پیشوائے دین کی معمولی خدمت سے بھی محروم رہا تو میری اس معلومات کا عدم وجود برابر ہے۔ لہٰذا مستدعی ہوں کہ آپ

حضرات ازراہ عنایت مجھ کو اسقدر اجازت مرحمت فرمائیں کہ میں بھی قسمت آزمائی کروں اور ایک نسخہ لکھوں جس کو یہ مقتدر معالج بھی ملاحظہ فرمائیں اور بعد ترمیم واصلاح اگر مناسب متصور ہو تو اس کا استعمال کیا جائے ورنہ چاک کر دیجیے گا۔ حکیم نصیر الدین صاحب کی اس خلوص آمیز تقریر کا ایسا گہرا اثر ہوا کہ اخوان ملت نے بالاتفاق کہا کہ حکیم صاحب آج بلا افتراق حیثیت ہم غلامان وارثی کو یہ استحقاق مساوی ہے کہ اپنے رہنمائے کامل کی صحت وتندرستی کے واسطے جو ہو سکا کوشش ہو ضرور کریں۔ اسلئے ہمارا یہ خیال ہے کہ حضور کی صحت کی نسبت کوئی خدمت ایسی نہیں معلوم ہوتی جو ہمارے دوش بدوش آپ نہ کر سکتے ہوں۔ بہت ممکن ہے کہ آپ ہی کا خلوص آقائے نامدار کو پسند آجائے اور وہ بندہ نواز صحت ظاہری کی جانب طبیعت رجوع فرمائیں۔ لہٰذا ہم خوشی کے ساتھ عرض کرتے ہیں کہ جس طرح آپ نے اس مبارک خیال کا اظہار کیا ہے اسی طرح بغیر کسی انتظار کے نسخہ کی ترتیب میں عجلت فرمایئے۔ بقول:

آن دم کہ دل بعشق دہی خوش دمے بود
درکار خیر حاجت، ہیچ استخارہ نیست

﴿جس لحظہ دل عشق کو دے دیا جاتا ہے وہ بہت خوش قسمت لمحہ ہوتا ہے اور نیک کام میں استخارہ کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔﴾

چنانچہ حکیم صاحب موصوف نے اسی وقت ایک نسخہ پینے، ایک جوارش کا، ایک گولیوں کا، ایک قیروطی کا، ایک لخلخہ کا لکھا جس کے ہر جزو پر حکیم یعقوب بیگ صاحب، حکیم عبدالحئی صاحب، حکیم منصب علی صاحب، حکیم جمیل الحق صاحب نے غور کیا اور ان حضرات کے مشورے سے تھوڑی ترمیم کے بعد ہر ایک نسخہ مکمل سمجھا گیا اور فوراً ان کی تیاری کا انتظام ہوا اور بعد عصر پہلی خوراک پلا دی گئی۔

اب ہر شخص ہمہ تن گوش بر آواز تھا کہ عنقریب یہ مژدہ سنیں گے کہ حکیم نصیر الدین صاحب کا علاج موافق مزاج ہوا مگر ہماری بدقسمتی سے معاملہ برعکس ہوا کہ بجائے سکون کے شدائد مرض میں ترقی ہوئی اور ہفوات ضعف سے حضور نے خاموشی اختیار فرمائی۔ اگر کسی وقت کوئی بات کی بھی تو ایسی ضعیف آواز سے کہ جس کا سننا اور سمجھنا بھی خدام کو دشوار تھا۔ یہ حالت دیکھ کر اطباء متفکر ہوئے اور اکثر تدبیریں کیں مگر کوئی کوشش بکار آمد نہ ہوئی۔

ہر چند شدائد مرض ناقابل برداشت تھے لیکن حضور نے کمال استقلال سے وہی عاشقانہ شان دکھلائی جو آپ کے مسلک کی مخصوص صفت ہے کہ بجز سکوت وتحمل کے آپ کے کسی

فعل سے اضطرار کا ضمناً بھی اظہار نہیں ہوا۔ بلکہ اطباء نے بھی اگر پوچھا کہ مزاج کیسا ہے تو نہایت اطمینان سے ہی ارشاد ہوا کہ اچھا ہے۔ یا دردسر یا تشنج اعضاء کو تصریحاً دریافت کیا تو قبلہ عالم نے مجملاً بھی کسی تکلیف کا ذکر کبھی نہیں فرمایا اور کسی حالت میں حرف شکایت زبان پر نہیں آیا۔

بلکہ اس علالت پر موقوف نہیں ہے۔ حضور کا صبر وتحمل ہمیشہ آبائی رضا وتسلیم کا نمونہ رہا ہے اور آپ کے عادات میں ہے کہ کبھی مرض کا اظہار نہیں کیا اور نہ کبھی اس کے درد سے بیقرار ہوئے۔ خدام کو اندازے سے اگر کسی تکلیف کا امتیاز ہوا تو بہ اصرار تمام علاج کیا۔ وہی صورت اس علالت میں پیش آئی کہ حضور نے کسی تکلیف کی تصریح نہیں فرمائی اور اس آخری نسخہ کے استعمال کے بعد بھی جو مرض کی شدت ہوئی اور تدبیر سے اس کا ازالہ نہ ہوسکا تو شاید اس کا بھی یہی سبب ہو کہ شکایات کا کلیۃً انکشاف نہ ہوا اور اطباء مجبور ہو گئے حتیٰ کہ حرارت غریزی سرعت کے ساتھ انحطاط پذیر ہوئی اور امید صحت منقطع ہونے لگی۔

عصر کے بعد شدت ضعف سے انتظام انفاس میں غیر معمولی تغیر ہوا اور وہ ذکر خاص جس کا اخفا حضور نے ہمیشہ بکمال احتیاط فرمایا تھا اب ضعف کی وجہ سے اس کا اظہار ہونے لگا اور اسی دوران میں بعض ایسے کلمات بھی جناب حضرت نے فرمائے جن کے مفہوم سے خدام نے یہ قیاس کیا کہ شاید اسی رات کے آخری حصہ میں ہماری حسرتیں پامال اور ہمارا شیرازہ منتشر ہو جائے گا چنانچہ بعد مغرب اس حالت میں اور ترقی ہوئی اور وقتاً فوقتاً ہماری بدنصیبی کے آثار بڑھتے گئے۔

نصف شب کے بعد اطباء نے بلحاظ پرہیز ایک ہفتہ سے پانی کا استعمال جو ممنوع گردانا تھا اب وہ احتیاط غیر ضروری سمجھی گئی اور حضور کو پانی پلایا گیا لیکن قابل حیرت یہ امر ہے کہ ہر چند ضعف پہلے سے اس وقت بہت زیادہ ہو گیا تھا۔ مگر دفعتاً آپ کے مقدس انفاس تیز رفتار بھی ہوئے اور قوی آواز سے اثبات حضرت احدیت جل جلالہ کا اظہار کرنے لگے جس کا جملہ حاضرین پر بھی خاص اثر ہوا اور اس فیضان وارثی سے ہر شخص بقدر حیثیت مستفیض ہوا لیکن ۳ بجے کے بعد حکیم یعقوب بیگ صاحب نے نبض دیکھی تو بیتاب ہو کر رونے لگے۔ فیضو شاہ صاحب شربت انار میں پانی ملا کر لائے اور ایک چمچہ حضور کو پلایا مگر دوسرا چمچہ تو وہ فرو نہ ہوا۔

اس وقت میں بھی جناب والا کے پاس حاضر تھا اور ایک ہاتھ سے سر اقدس کی حرارت اور ایک ہاتھ سے قلب اطہر کی حرکت دیکھ رہا تھا اور فیضو شاہ صاحب بھی قریب بیٹھے

تھےاور شیدا میاں اور بابو کنیالال صاحب چہرۂ اقدس کے سامنےاور حافظ احمد شاہ صاحب پائیں کھڑے تھےاور تقریباً پچاس ساٹھ حلقہ بگوش مؤدب اور خاموش استادہ تھے کہ ناگاہ سرکار عالم پناہ نے ایک سنگین سانس کھینچی اور قریب قریب پندرہ بیس منٹ کے بعد جب وہ باہر نکلی تو صاف طور پر دیکھا کہ وہ سانس برنگ سبز اور قبلہ عالم کی ہم شبیہ تھی جو تعینات عنصری سے جدا ہو کر شب جمعہ کو سوا چار بجے واصل ذات حضرت الوہیت ہوئی۔

اِنَّالِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن ۔

حیف درچشم زدن صحبت یار آخر شد
روئے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد

﴿افسوس! پلک جھپکتے ہی وصال یار کی گھڑیاں بیت گئیں اور ابھی جی بھر کے چہرۂ گل دیکھا بھی نہیں تھا کہ موسم بہار تمام ہو گیا۔﴾

لیکن اس سانحہ قیامت خیز کے بعد حاضرین کی حالت ایسی حیرت انگیز نظر آئی جو عجیب بلکہ عجیب تر تھی ۔ اسلئے کہ فراق یار عموماً شاق ہوتا ہے چہ جائیکہ ایسے شاہد دلنواز کی مفارقت غیر معمولی مصیبت تھی اور یہ دردناک حادثہ اگر ارادتمندوں کو اس وقت ہلاک کر دیتا تو بعید نہ تھا۔ کیونکہ ان کی آنکھوں کے سامنے ان کا خرمن مراد ہمیشہ کیلئے تباہ و برباد ہو گیا۔ کل جو مکان بزم عیش کے نام سے موسوم تھا۔ آج وہ بیت الحزن اور ماتم کدہ بن گیا لیکن یہ کسی قوت کاملہ کا کرشمہ تھا کہ جملہ حلقہ بگوش دم بخود ساکت اور خاموش ہو گئے ۔ اگر یہ گمان کیا جائے کہ کثرت غم اور فرط حزن وملال کے اثر سے ان کا یہ حال ہوا کہ متحیر ومبہوت ہو گئے تو یہ بھی نہیں کہہ سکتے کیونکہ اسی کے ساتھ یہ بھی ہے کہ اس وقت مکان میں جو حاضر رہا بیتاب وبیقرار نہ ہوا اور جب وہی شخص صدر دروازہ کے باہر گیا تو زار زار رونے لگا۔

بہر کیف کوئی سبب کیوں نہ ہو مگر واقعہ یہ ہے کہ چند ساعت سکوت کا عالم رہا اور جب یہ کیفیت فرو ہوئی تو حسب فطرت سب خدام ملول محزون ہوئے اور اپنے آقائے نامدار کے گرد وپیش ناسحر حاضر رہے ۔ صبح کو مشورہ ہوا کہ آپ کا جسد پاک کس مقام پر سپرد خاک کیا جائے۔ ایک گروہ جس میں بعض رئیس بھی تھے ان کی یہ رائے ہوئی کہ شاہ اولیس کے گورغریباں میں مزار بنایا جائے ورنہ پختہ مکان بیکار ہو جائے گا۔ دوسرے گروہ کا جس میں فقراء بھی شامل تھے یہ خیال ہوا کہ اسی مکان بلکہ اسی مقام پر حضور آرام فرمائیں کیونکہ جناب حضرت نے متواتر فرمایا ہے کہ ''فقیر جہاں مرے وہیں اس کو دفن کر دیں''۔

بلکہ اس گروہ نے اپنے خیال کی تائید میں بطور اس واقعہ کا حوالہ دیا کہ بدام شاہ جو پہلے خادم خاص اور بعد کو موضع کھیوی میں گوشہ نشین تھے۔ان کے انتقال کی خبر جب حضور کو ہوئی تو شیدا میاں اور قاضی بخشش علی کو یہ حکم ہوا: ''جاؤ بدام شاہ کو غسل دیکر اسی مقام پر دفن کرنا جہاں وہ مرے ہیں'' اور ایک رنگین تہبند اور لنگوٹ ان کے کفن کے واسطے مرحمت ہوا۔

اتفاق سے انکا انتقال بالاخانہ پر ہوا تھا اور قبلہ عالم کا یہ حکم کہ جہاں مرے ہیں وہیں دفن کرنا تو اس کی تصریح کیلئے قاضی بخشش علی نے یہ عرض کی کہ حضور چھت میں ان کی قبر کیونکر بنائی جائے گی؟ جناب والا نے یہ سمجھ کر کہ قاضی صاحب نفس مفہوم کو نہیں سمجھے بغرض تنبیہ مکرر ارشاد فرمایا کہ ''نہیں جہاں مرے ہیں وہیں ان کو دفن کیا جائے۔''

اب خدام پریشان تھے کہ اس فرمان کی تصریح کیونکر کی جائے۔آخر شیدا میاں نے عرض کیا کہ حضور آثار سقف میں بدام شاہ اس طرح دفن ہو سکتے ہیں کہ اسی مقام کے تحت میں قبر کھودی جائے اور چھت بھی اسی قدر کاٹ کر بدام شاہ کو اوپر سے قبر میں گرادیں۔اس پر حضور اقدس نے یہ ہدایت کی: ''مردہ کو تکلیف نہیں دیتے، گرانے کی کیا ضرورت ہے نیچے لاکر اسی مقام پر دفن کر دینا۔'' چنانچہ اس حکم کی تعمیل اسی طریق سے ہوئی۔لہٰذا ہمارے مجتہد حقیقی نے جب کہ اپنے خادم کی قبر اسی مقام پر بنوائی تو لازم ہوا کہ سرکار عالم پناہ کی آرامگاہ اسی مقدس گوشۂ زمین میں ہو جہاں دم آخر تک آپ نے استراحت فرمائی ہے۔

گو حضرات سابق الذکر کو بھی اس ہدایت وارثی کا بخوبی علم تھا لیکن اپنی تجویز میں ترمیم نہ کی اور پسند نہ ہوا کہ یہ پختہ خانقاہ حضور کی آرامگاہ بنائی جائے ہر چند بظاہر یہ لوگ اپنی کثرت اور وجاہت کے اعتبار سے ہر طرح کی قوت رکھتے تھے مگر دوسرے قلیل التعداد گروہ نے خدائے برتر وتوانا کی امداد پر بھروسہ کیا اور اس خدمت کیلئے آمادہ ہو گئے کہ بقدر امکان اس فرمان کی تعمیل ضرور کریں گے جس کی جناب حضرت نے متواتر ہدایت فرمائی اور اگر ہمارا یہ ارادہ غبار نفسانیت سے آلودہ نہیں ہے تو یقینی افضال الٰہی شامل حال ہوگا اور ہمارا خیال پورا ہو کر رہے گا اور انشاءاللہ جناب والا اسی گوشۂ زمین میں ہمیشہ آسودہ رہنا پسند فرمائیں گے جہاں اس وقت نظارۂ جمال شاہد مطلق میں محو اور مستغرق ہیں۔

بس فوراً یہ حلقہ بگوش فرمانبرداری کے جوش میں کھڑے ہو گئے اور حضور کا جسد اطہر معہ اس مقدس بستر کے مشرقی صحنچی کے قریب لائے اور آپ کی جائے استراحت پر قبر کا نشان لگا کر کھودنے کا حکم دیا۔اسی عرصہ میں سب انسپکٹر تھانہ قصبہ کرسی معہ چند کانسٹیبل اور

چوکیداران کے آئے اور قبر بنانے کی ممانعت کی اور وجہ مزاحمت یہ بتائی کہ سید محمد ابراہیم کی درخواست آئی ہے کہ تم لوگ حاجی صاحب کا مکان خراب کرنا چاہتے ہو۔ جواب ان کے ورثاء کی ملک ہے۔

ان لوگوں نے آسانی تھانہ دار کو سمجھا دیا کہ جناب حاجی صاحب قبلہ کا مذاق و شرب یہ تھا کہ ہمیشہ تعلقات دنیا سے قطعی احتراز رہا۔ بلکہ ذاتی ضروریات کے انتظام کو مکروہ اور حرام سمجھا۔ مثلاً خورد و نوش کا یہ حال تھا کہ کھانا بھی جو کھایا وہ اپنا نہیں۔ کوئی دوسرا شخص لایا تو آپ نے نوش فرمایا۔ کپڑا جو استعمال کیا وہ بھی اپنا نہیں۔ مریدین ہمیشہ تہبند تبدیل کراتے تھے۔ حتیٰ کہ جو تہبند زیب جسم ہوا اس کو بھی نہیں رکھا۔ جدید تہبند لانے والے کو مستعمل تہبند مرحمت ہوا کرتا تھا۔ علیٰ ہذا بود و باش کے واسطے مکان بھی نہیں بنوایا۔ ہمیشہ دوسرے کے مکان میں رہے۔ چنانچہ یہ مکان بھی حضور کی آسائش کے واسطے مریدین نے بنوایا تھا اور مریدین ہی اس کو آپ کی دائمی آرامگاہ بناتے ہیں۔ لہٰذا آپ کی یہ سادہ زندگی یادگار رہے گی اور تاریخ کے صفحات میں اس کا ذکر رہے گا کہ یہی ذات ستودہ صفات ایسی تھی جس نے تعلقات عالم سے انقطاع کلی فرمایا۔

یہ سن کر سب انسپکٹر اسوقت تو واپس گئے مگر تھوڑے عرصہ میں پھر آئے اور کہا کہ اس کا کیا جواب ہے کہ بستی کے اندر قبر بنانا قانوناً ممنوع ہے؟

بابو کنہیالال صاحب نے کہا کہ واقعی حدود میونسپلٹی میں اس کی احتیاط ہے کہ عام طور پر قبریں نہ بنائی جائیں لیکن یہاں میونسپلٹی نہیں۔ اب تھانہ دار مزاحمت سے دست بردار ہوئے مگر سنا گیا ہے کہ پھر اسی مضمون کی درخواست حاکم ضلع کو دی گئی اور جب وہاں سے بھی کامیابی نہ ہوئی تو پھر یہ کیا گیا کہ بااثر اشخاص کے ذریعہ سے مزدوروں کو قبر بنانے سے روک دیا۔

جب مزدور چلے گئے تو اہل ارادت نے اس خدمت کو بھی انجام دیا اور کسی نہ کسی طرح سے پیشوائے برحق کی قبر اپنے ہاتھوں سے بنا کر تیار کی اور غسل دیکر نماز کیلئے ہر چند انتظام کیا کہ لوگ صف بستہ ہو جائیں مگر مکان کے اندر اس کثرت سے ہندو مسلمان مجتمع ہو گئے تھے کہ شانہ ہلانا دشوار تھا جو شخص جہاں کھڑا رہا وہیں کھڑا رہا۔ مجبوراً اسی کو صف بندی خیال کیا گیا اور حافظ عبدالقیوم صاحب کرنالی نے نماز پڑھائی اور قریب پانچ بجے اس مجسم نور الٰہی کو سپرد خاک کیا۔ بقول:

گویا جگر زمین کشادند
آن نور خدا درو نہادند

﴿زمین نے اپنا جگر چاک کیا اور وہ نور خدا اس میں سما گیا۔﴾

لیکن جب اسی مکان میں مزار قدس تعمیر ہوگیا تو حضرات سابق الذکر کو سجادگی کا شوق ہوا اور دوسرے روز خاص جلسہ میں یہ تحریک کی کہ سید محمد ابراہیم صاحب یہاں کے سجادہ نشین بنائے جائیں مگر بدقسمتی سے اس میں بھی اختلاف ہوا کیونکہ محرکین نے تو ذاتی طور پر یہ تجویز کیا تھا کہ مثل دیگر آستانوں کے یہاں ایک سجادہ نشین ہونا چاہیے مگر غلطی یہ ہوئی کہ اس مقتدر گروہ نے یہ خیال نہ کیا کہ ہماری یہ تحریک شرب وارثی کے بالکل خلاف ہے۔

چنانچہ متعدد ارادتمندوں نے جن میں فقرائے تہبند پوش اور خدام وقدیم حلقہ بگوش بھی تھے اختلاف کیا اور اس مسئلہ سجادگی کو حضور کی ہدایت کے منافی بتایا اور کہا کہ رہنمائے کامل کا یہ ارشاد بھی ہم کو یاد ہے کہ جو سرکار عالم پناہ نے ہماری ہدایت کے واسطے بار بار فرمایا ہے کہ: ''ہماری منزل عشق ہے۔ اسلئے ہمارا کوئی خلیفہ اور سجادہ نشین نہیں ہوسکتا جو ہم سے محبت کرے وہی ہمارا ہے''۔

اور یہ بھی کہا کہ ہماری طرح آپ حضرات بھی واقف ہیں کہ یہ فرمان وارثی تحریر میں آچکا ہے اور وہ تحریر جسٹس سید شرف الدین کے پاس محفوظ ہے جس کا ذکر کتاب عین الیقین مطبوعہ ۱۳۱۱ ہجری میں بصراحت درج ہے۔ اسلئے ہمارے سلطان دین کا کوئی سجادہ نشین نہیں ہوسکتا۔ البتہ اگر انتظام آستانہ پاک کیلئے غلامان وارثی کسی کو منتخب کریں تو غیرت ارادت اس کی مقتضی ہے کہ اس کو سجادہ نشین نہ کہیں جو ہمارے شرب کے صریح خلاف ہے بلکہ اس کے واسطے اگر متولی، دیوان، صاحبزادہ، منیجر، منتظم یا کوئی اور ممتاز خطاب تجویز فرمائیں تو ہم کو کوئی عذر نہ ہوگا اور آپ کے اس انتخاب کو قدر کے ساتھ تسلیم کریں گے۔

جب ارباب جلسہ کے اختلاف آراء سے یہ معلوم ہوگیا کہ عہدۂ سجادگی شرب وارثی کے قطعی منافی ہے اور مریدین بالاجماع کسی کا سجادہ نشین ہونا پسند نہ کریں گے تو انھوں نے اس کی کوشش کی کہ سید محمد ابراہیم صاحب کسی طرح احرام پوش ہوجائیں مگر احرام پوشی اس وقت قابل احترام ہوگی جب حاجی صاحب قبلہ کا کوئی قدیم فقیر ان کا لباس تبدیل کرائے۔

بالآخر اس کام کے واسطے معروف شاہ صاحب کو تجویز کیا اور بعض حضرات نے ان کو سمجھایا کہ ہم لوگ بغرض انتظام سید محمد ابراہیم صاحب کو منتخب کرتے ہیں۔ مگر مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ منتظم تہبند پوش ہو۔ امید ہے کہ آپ ان کا لباس تبدیل کرادیں گے۔ شاہ صاحب موصوف نے ان کی استدعا منظور فرمائی اور سوم کے روز بعد قرآن خوانی اور قل وغیرہ کے معروف

شاہ صاحب نے حاضرین کو مخاطب کیا اور کہا کہ یہ مسلمہ ہے کہ حسب ارشاد جناب حضرت یہاں کا کوئی سجادہ نشین نہیں ہوسکتا لیکن ضرورت اس کی ہے کہ انتظامی خدمت کسی کے سپرد کی جائے۔ اسلئے سید محمد ابراہیم کو بطور منتظم مقرر کرتے ہیں لیکن یہاں کی تقریبات معینہ میں نہ ان کو تصرفات کا حق ہوگا اور نہ تنظیم سابق میں ترمیم کا اختیار ہے جو شخص جس خدمت کیلئے مامور ہے وہ بدستور رہے گا۔

مگر افسوس اس کا عملدرآمد نہ ہوا بلکہ خود سید محمد ابراہیم صاحب نے اپنے نام کے ساتھ سجادہ نشین بھی لکھا اور خدام بھی اپنے عہدوں سے معزول ہوئے۔ خدا کی شان نظر آتی تھی کہ ادھر تو حصول اغراض کے اہتمام میں یہ محویت تھی کہ سجادگی کے جوش میں مشربی احکام فراموش تھے اور ادھر غلامان وارثی کی حسرتیں جب پامال ہوئیں تو اس دلخراش واقعہ سے وہ انقلاب ہوا کہ ارادتمندوں کی زندگی خراب ہوگئی۔ کوئی دلفگار تعلقات سے دست بردار ہوا۔ غریب الوطنی منظور کی۔ خویش واحباب سے دور رہنے لگا کوئی غمگین گوشہ نشین ہوا۔ صدمہ فراق نے اس کو زندہ درگور کا مصداق کیا۔ کسی بیقرار خاطر نے دیوانہ وار صحرانوردی اختیار کی۔ خدام کا شیرازہ منتشر ہوگیا۔ ہر گھر میں رنج والم سوز وگداز کا چرچا تھا۔ ہر طرف سے آہ وفغان کی آواز آتی تھی۔ کوئی نوحہ خوان تھا۔ کسی نے مرثیہ لکھا۔ چنانچہ اس نحیف نے بھی بطور یادداشت یہ قطعہ تاریخ تالیف کیا:

حاجی وارث علی شاہ زمن سید و سردار کل، گردوں جناب

حاجی وارث علی زمانوں کے شاہ ہیں۔ آپ زمین آسمان کے سردار ہیں۔

آفتاب فقر و دین، شمع ہدیٰ شرقی و غربی ز ذاتش فیضیاب

فقر اور دین کا آفتاب اور ہدایت کی شمع ہیں۔ ان کے وجود بابرکت سے اہل مشرق ومغرب نے فیض پایا ہے۔

خسرو اقلیم تسلیم و رضا جلوۂ سبطین و شان بوتراب

آپ تسلیم و رضا کی سلطنت کے فرمانروا، حسنین کریمین اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم کی شان کے مظہر ہیں۔

بے نیاز از ہر دو عالم ذات او عاشق و معشوق و فرد و لاجواب

ان کی ذات دونوں جہانوں سے بے نیاز ہے۔ وہ مثالی عاشق، مثالی معشوق اور بے مثل شخصیت ہیں۔

پختگی بخشد بہ خامان طریق پختہ را در لحظہ سازد کامیاب

آپ نے طریقت کے ٹو واردوں کو پختہ پن دیا، اور پختہ کاروں کو ایک لمحے میں کامیاب بنا دیا۔

شرح اوصافش چہ آرم در بیان آفتاب آمد دلیل آفتاب

ان کی صفات کا بیان میں کس طرح کروں، سورج کی دلیل تو سورج سے ہی دی جا سکتی ہے

صبح آدینہ یکم شہر صفر آن صفی انداختہ بر رخ نقاب

آدینہ کی صبح ماہ صفر کی پہلی تاریخ کو اس صفت الاوصاف نے چہرے پہ نقاب ڈال لیا۔

غرق ظلمت شد جہان از ہجرتش نظم عالم گشت از نقلش خراب

آپ کی رحلت سے دنیا تاریکی میں ڈوب گئی۔ آپ کے وصال سے دنیا کا نظام درہم برہم ہو گیا۔

ہر طرف شور و فغان اندر جہاں خلق را شد روز چوں روز حساب

جہان میں ہر طرف آہ و فغاں کے نالے بلند ہونے لگے۔ لوگوں کیلئے وہ دن روز قیامت کا دن ہو گیا۔

قدسیان بر چرخ وانسان بر زمین ہر دو عالم از غمش واضطراب

آسمان پر فرشتے اور زمین پر انسان، دونوں جہاں ان کے غم سے مضطرب ہو گئے۔

مہ رخاں را در غمش جان تا شکیب عاشقان را از فراقش دل کباب

چاند چہرے ان کے غم سے گہنا گئے، اور چاہنے والوں کے دل ان کی فرقت سے کباب ہو گئے۔

بہر تاریخ چنیں اوگفت بگفت پس چرا شد آفتاب اندر حجاب

جب اوگھٹ نے تاریخ کیلئے کہا، تو آیا کہ ''سورج پس پردہ کیوں ہو گیا۔''

(۱۳۲۳ھ)

الغرض بعد فاتحہ سوم جب غلام وارثی اپنے اپنے وطن جانے لگے تو میں نے بھی جناب شاہ فضل حسین صاحب سے عرض کیا کہ مجھ کو کیا کرنا چاہیے۔ جناب ممدوح نے فرمایا کہ تمھارے واسطے یہی مناسب ہے کہ پیشوائے برحق کے حکم کی تعمیل کرو اور اپنے والد کی قبر پر رہو اور یاد رہے کہ اس لباس کی نگاہداشت میں اگر ناقابل برداشت واقعات بھی پیش آئیں تو پائے استقلال کو لغزش نہ ہو۔ چنانچہ اپنے شفیق ناصح کی یہ نصیحت سن کر اسی روز سرکار عالم پناہ کے مزار پر انوار سے رخصت ہو کر دیوی شریف سے چلا اور ۵ صفر ۱۳۲۳ ہجری کو بچھرایوں میں آ کر مسجد سہراب شاہ میں رہنے لگا۔

جب احباب میرے مستقل قیام سے آگاہ ہوئے تو ان کی کوشش سے احاطہ مسجد میں ایک حجرہ بھی تعمیر ہو گیا اور والد ماجد کے عرس کا زمانہ آیا تو اس میں ایک تاریخ میں نے اور بڑھائی جس کو اپنے مولا کے نام پاک کے ساتھ منسوب کیا اور اس سال سے سترہ کو حضور کے قل کے بعد عرس کی تقریب ختم ہونے لگی اور اسی سال سے اس تقریب میں نمایاں ترقی ہوئی کہ مہمان بھی زیادہ آنے لگے اور ان کے آرام و آسائش کا ضروری سامان بھی مجتمع ہو گیا۔

الغرض مابعد آستانہ پاک کے انتظام میں اور کیا کیا انقلابی صورتیں پیش آئیں اور مقبرہ شریف کیونکر تعمیر ہوا اور سجادگی کا داغ ہمارے مشرب کے شفاف دامن سے کب اور کیونکر چھوٹا اور بارگاہ وارثی کی رونق اور ترقی کیلئے ذی حوصلہ ارادتمندوں نے کس اولوالعزمی سے کام لیا اور میں نے سفر حجاز و عراق کیونکر کیا۔ یہ جملہ حالات اگر کارساز حقیقی کو منظور ہے تو دوسری جلد میں نگارش کروں گا۔

لیکن اس فقیر کو تقریباً چار سال تک جو آستانہ اقدس پر حاضری کا موقع ملا یہ سعادت میرے اعمال کی خوبی کا نتیجہ نہ تھا۔ بلکہ پیشوائے برحق کی محض بندہ نوازی اور پرورش تھی۔ ورنہ مجھ ایسا سگ دنیا اس لائق ہرگز نہ تھا کہ اس مقدس مقام پر اس کا گذر بھی ہوتا اور واللہ اس گداگر کی مجال نہ تھی کہ در اقدس کی جاروب کشی کا خیال بھی کرتا جو درحقیقت میرے اور میرے آباؤ اجداد کے فخر و مباہات کے واسطے کافی ہے اور فی الواقع یہی عرصہ زندگی میرا جو بارگاہ وارثی کی دربانی میں گزرا اس قابل ہے کہ اس کو سرمایہ ناز کہوں تو بے جا نہ ہوگا۔ بقول:

اگر ہر موئے تن گردد زبانے
زتو راتم بہ ہر یک داستانے

﴿اگر میرے بدن کے ہر بال کے ساتھ زبان ہوتی تو ہر ایک سے تیری ایک ایک داستان بیان کرتا۔﴾

اور آج بھی اس دور افتادہ کو اگر کوئی تمنا ہے تو یہ ہے کہ بقیہ عمر اسی در اقدس کی دربانی اور اسی آستانہ پاک کی جاروب کشی میں کٹے۔ بقول:

جائے آنست کہ جان بر سر کویت بازم
خاک درگاہ پر تو بر تارک سر اندازم

﴿یہ جگہ وہ ہے کہ جہاں کو تیرے کوچے میں داؤ پر لگا دیا جائے اور تیرے آستانے کی خاک پر ڈال دوں۔﴾

لہٰذا اپنی زندگی کے اس حصہ کا حال نگارش کر چکا جو درحقیقت میری زندگی کا خلاصہ اور جس پر میری زندگی کے مآل کا انحصار ہے۔ البتہ اس چند روزہ حاضری کے دوران میں جو مستعد اور غیر معمولی تصرفات دیکھے ان کو مفصل تحریر کرنے میں یہ خیال ہے کہ اگر بالترتیب نگارش کروں تو ضخیم دفتر ہو جائے گا اور علیٰ ہذا حضور کی ہدایات اور ارشادات کی بھی تعداد کم نہیں ہے اسلئے ان کو بھی بالتفصیل نہیں لکھ سکتا اور علاوہ اس کے اکثر ملفوظات اخوان ملت کی تالیفات میں شائع بھی ہو چکے ہیں یا بعض ایسے ارشادات ہیں جن کو شرب ومسلک سے گہرا تعلق ہے ان کی بالاعلان اشاعت خلاف معلوم ہوتی ہے لیکن فی الجملہ اس کی بھی ضرورت دکھائی دیتی ہے کہ اس سلسلہ میں بعض واقعات کا بھی ذکر ہو اور چند ملفوظات بھی لکھے جائیں۔

مگر اسی کے ساتھ یہ بھی عرض کروں گا کہ میری محدود واقفیت نہ اس کی متقاضی ہو سکتی ہے کہ در دولت کے جملہ واقعات اور پیشوائے برحق کے تمامی تصرفات نقل کرے اور نہ میری استعداد اس لائق ہے کہ ان تصرفات کی حقیقت اور ماہیت کماحقہٗ بیان کرے۔ کیونکہ روزانہ کا یہ دستور تھا کہ مختلف حیثیت اور مختلف خیال کے ارادتمند حاضر ہو کر حسب استعداد فیضان وارثی سے مستفیض ہوا کرتے تھے۔ مگر انہیں ارادتمندوں میں اکثر حضرات کی طلب اور معاملات کو حقانیت اور روحانیت سے ایسا سروکار ہوتا تھا جس کی تشریح اور تصریح کرنا تو یقینی ناممکن ہے بلکہ ان پر اسرار واقعات کا تو مجملاً ذکر کرنا دشوار ہے۔ اسلئے وہ تصرفات جو رموز واسرار سے معمور ہیں اور وہ ارشادات جن کا نکات معنوی سے سروکار ہے ان کو تحریر میں لانا قطعی میرے امکان سے باہر ہے۔

البتہ مجھ ظاہر بیں کا تو یہی منصب ہے کہ وہی حالات نگارش کروں جو بظاہر ہمارے فہم وادراک کے لائق ہوں جیسا کہ طالبان الٰہی کا عام طور سے حلقہ غلامی میں داخل ہونا جس کا سلسلہ قریب قریب ہر وقت جاری رہتا تھا۔ مگر مشکل یہ ہے کہ معمولی واقعات میں اکثر ایسے رموز واسرار پائے گئے جن کا ہماری عقل میں آنا محال ہے چنانچہ بارہا ایسے بھی طالب خدا آئے جو مضطر وبیقرار دیوانہ وار زبان حال سے کہتے تھے:

جز تو کس در جہان نمی خواہیم
بے وصال تو جان نمی خواہیم

﴿آپ کے سوا مجھے جہان میں کچھ نہیں چاہیے اور اگر آپ کا وصال نہ ہو تو جان کی ضرورت بھی نہیں ہے۔﴾

بلکہ یہ کہنا شاید غلط نہ ہوگا کہ بارگاہ وارثی کی معمولی بات بھی اپنی حقیقی حیثیت میں غیر معمولی بات کی اہمیت سے کسی طرح کم نہ تھی ۔مثلاً ایک صاحب پیلی بھیت سے آئے اور حسب اجازت درگاہ شاہ ولایت صاحب میں قیام کیا اور بعد ادائے نماز ظہر وہ داخل سلسلہ وارثی ہوئے ۔مگر نماز عصر کیلئے ان کو شاہ فضل حسین صاحب نے بلایا تو انھوں نے جواب میں کہا کہ جناب شاہ صاحب میں تو مرید ہو چکا ہوں اب نماز کیسی بقول:

جو دل تمارخانہ میں بت سے لگا چکے
وہ کعبتین چھوڑ کے کعبہ کو جا چکے

شاہ صاحب نے فرمایا کہ مرید ہونے کے بعد آپ نماز کیوں نہیں پڑھیں گے جو فرض عین ہے ۔وہ سادہ مزاج متحیر ہو کر بولے کہ میں نے تو یہ سنا تھا کہ جناب حاجی صاحب قبلہ کے مرید کو نماز معاف ہو جاتی ہے اسی وجہ سے میں یہاں آیا اور حلقۂ غلامی میں داخل ہوا ۔شاہ صاحب موصوف نے مجھ کو بلا کر فرمایا کہ ان کے خیالات فاسد ہیں ۔خدا کے واسطے سمجھاؤ کہ نماز پڑھیں ۔چنانچہ میں نے ان سے دریافت کیا تو نماز نہ پڑھنے کا سبب وہی مجھ سے بھی بیان کیا ۔میں نے کہا کہ آپ نے پیر و مرشد سے بھی اجازت لی ہے؟ کہا: ''یہ تو نہیں کیا ۔''

میں نے کہا: ''بغیر ان کے معاف کئے نماز کیونکر معاف ہو جائے گی ۔اگر وہ کہہ دیں تو چھوڑ دیجئے ورنہ اس حکم خداوندی کو آپ خود کیونکر چھوڑ سکتے ہیں ۔''

میرا یہ کہنا ان کی سمجھ میں آ گیا اور اسی وقت میرے ہمراہ سرکار عالم پناہ کی خدمت میں حاضر ہوئے ۔میں نے جناب حضرت سے یہ قصہ عرض کیا تو حضور مسکرائے اور فرمایا کہ ''ابھی تین برس اور نماز پڑھو ۔پھر چھوٹ جائیگی ۔''اور مخصوص طریقہ سے درود شریف پڑھنے کی ہدایت فرمائی ۔وہ صاحب نہایت مسرور ہو کر واپس آئے اور بکمال خضوع و خشوع نماز عصر ادا کی اور شاہ فضل حسین صاحب سے کہا کہ جناب میری نماز بھی اب تین برس کے بعد چھوٹ جائے گی ۔

پھر دوسرے سال میلہ کاتک میں وہ حاضر ہوئے تو ان کی حالت یہ دیکھی کہ ہر وقت باوضو رہتے ہیں اور درود شریف کا ورد ہے اور ذوق و شوق میں نماز ادا کرتے ہیں ۔مگر تیسرے سال وہ میلہ میں نہیں آئے تو ولی گوہر خان صاحب وارثی رئیس پیلی بھیت جب حاضر ہوئے اور ان سے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ ان کا انتقال ہو گیا ۔شاہ فضل حسین صاحب نے حساب کیا تو اس نمازی کے انتقال کی تاریخ وہی تھی جس روز تین سال پورے ہونے تھے جس کو دوسرے لفظوں میں یہ کہنا چاہیے کہ ہمارے بندہ نواز پیشوا نے اپنے اس مرید صادق کو تا دم مرگ ادائے

نماز کیلئے حکم فرمایا تھا جس وقت جسد عنصری سے روح کا تعلق چھوٹ گیا۔اس عابد خداشناس سے نماز بھی چھوٹ گئی لیکن تین سال کی قید لگانا یہ اس واقف اسرار اور مقبول پروردگار کا کام ہے جو منشاء الٰہی سے خبردار ہو۔وہ ہمیشہ وہی کہتا ہے جو قضاوقدر کا ارادہ ہوتا ہے۔بقول

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود
گرچہ از حلقومِ عبداللہ بود

﴿ان کی بات اللہ کی بات تھی اگر چہ الفاظ اس کے بندے کے منہ سے نکل رہے تھے مگر بات اللہ کی ہی تھی۔﴾

اسی مضمون کا ایک واقعہ یہ بھی ہے کہ منشی سید نجم الدین صاحب رئیس بانکے پور جو نہایت مقدس اور خداشناس شخص تھے اور ایک مرتبہ بلحاظ عقیدت دیوی شریف میں حاضر ہوئے تھے۔جب حضور بانکے پور تشریف لے گئے اور منشی صاحب سے ملاقات ہوئی تو موصوف نے بکمال ادب یہ استدعا کی کہ میری نماز چھڑا دیجئے۔جناب حضرت نے فرمایا کہ منشی جی نماز چھوڑنے کی چیز نہیں ہے ''وَمَاخَلَقْتُ الْجِنَّ وَالاِنْسَ اِلَّالِیَعْبُدُوْن ''منشی صاحب نے عرض کیا کہ اب نماز عبادتاً نہیں بلکہ عادتاً پڑھتا ہوں اور ایسی نماز بے سود معلوم ہوتی ہے۔سرکار عالم پناہ نے فرمایا کہ ''منشی صاحب وضعداری اسی میں ہے کہ مرتے دم تک نماز پڑھے جاؤ''۔چنانچہ چند روز کے بعد عین نماز عصر کی تیسری رکعت میں انتقال ہوا۔

علیٰ ہذا ۱۳۲۰ ہجری کا واقعہ ہے کہ پنجاب سے ایک مولوی صاحب آئے اور صدر دروازہ کے بالا خانہ میں جہاں ڈپٹی سید محی الدین صاحب وارثی و ڈپٹی قاضی لطیف عالم صاحب وارثی پہلے سے مقیم تھے۔مولوی صاحب بھی ایک جانب ٹھہرائے گئے۔دوسرے روز بعد نماز ظہر مولوی صاحب نے ان دونوں ڈپٹی کلکٹروں سے کہا کہ تم نے نماز کیوں نہیں پڑھی۔کیا علوم نہیں: ''مَنْ تَرَکَ الصَّلٰوۃَ مُتَعَمِّدًا فَقَدْ کَفَرَ'' بے نمازیوں کی ترہیب کیلئے حبیب رب العالمین ﷺ کا فرمودہ ہے۔بلکہ میں نے سنا ہے کہ جناب حاجی صاحب بھی نماز نہیں پڑھتے ہیں۔چنانچہ اسی کے متعلق ان سے گفتگو کرنے آیا ہوں۔مولوی صاحب کا یہ بیباکانہ کلام سن کر دونوں ڈپٹی کلکٹروں نے مجھ کو بلا کر یہ قصہ کہا اور خواہش ظاہر کی کہ ہم کو دوسری جگہ ٹھہرا دو۔

میں نے مولوی صاحب سے دریافت کیا کہ آپ کا کیا نام ہے،کہاں سے اور کیوں آئے ہیں؟

تو پنجابی لہجہ میں فرمایا کہ میرا نام عبداللہ ہے اور اسلئے ملتان سے آیا ہوں کہ حاجی صاحب سے نماز کی بابت گفتگو کروں ۔ کیونکہ نماز دین متین کی تھونی ہے ۔ کیا سنا نہیں ہے کہ ''اولین پرسش نماز بود'' اور یہ مسلمہ ہے کہ تارک نماز خارج از دائرہ اسلام ہے ۔ بقول:

خلاف پیمبرؐ کسے رہ گزید
کہ ہرگز بمنزل نخواہد رسید

﴿جو کوئی طریقت نبوی کے خلاف چلے گا کسی طور بھی منزل پہ نہیں پہنچ پائے گا ۔﴾

میں اسی وقت مولوی صاحب کو سرکار عالم پناہ کی خدمت میں لے گیا لیکن وہاں مولوی صاحب خاموش بیٹھے رہے ۔ جب واپس آئے تو پھر کہا کہ مجھ کو حاجی صاحب کے پاس لے چلو وہ کہاں ہیں ۔ میں نے کہا ابھی تو آپ ملاقات کر کے واپس آئے ہیں لیکن خیر دوبارہ چلئے اور پھر مولوی صاحب کو لے گیا ۔ اس مرتبہ حضور نے فرمایا کہ یہ کون ہیں ۔ عرض کیا: '' یہ ملتان سے آئے ہیں ۔'' ارشاد ہوا کہ ''چلو ٹھہرو ۔ پھر ملاقات ہوگی ۔''

غرض اسی طرح تین مرتبہ مولوی صاحب جناب حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے اور واپس آ کر یہی کہا کہ حاجی صاحب کہاں ہیں ان سے کچھ باتیں کروں گا ۔ آخر چوتھی مرتبہ حاضر ہوئے تو سرکار عالم پناہ نے فرمایا کہ مولوی صاحب بیٹھو ۔ مولوی صاحب فوراً قدمبوس ہوئے ۔ پھر حضور نے فرمایا کہ ''مولوی صاحب سے دین جاری ہے اور اسلام کے یہ حامی ہیں '' اور پھر مولوی صاحب سے مخاطب ہو کر ارشاد ہوا کہ '' جب ہم نے کافیہ شروع کیا اور استاد نے پڑھایا کہ الکلمۃ لفظ تو ہم نے کہا کہ جب کلمہ ایک لفظ کا نام ہے تو اس کا پڑھنا بیکار ہے ۔'' پھر فرمایا کہ ''مولوی صاحب ہم نے اپنے والد کا کتب خانہ تالاب میں ڈبو دیا'' اور ارشاد ہوا کہ: ''مولوی صاحب فِیْ اَنْفُسِکُم اَفَلَا تُبْصِرُوْن کے معنٰی جانتے ہو؟'' ۔ مگر مولوی صاحب خاموش اور کسی خیال میں ہمہ تن مستغرق بیٹھے رہے ۔ پھر حضور نے دریافت فرمایا کہ شب کو مثنوی مولانا روم کون پڑھتا تھا ۔ میں نے عرض کیا کہ یہی مولوی صاحب پڑھ رہے تھے تو کسی قدر تڑ شروہو کر جناب والا نے فرمایا کہ: ''مولوی صاحب سمجھ کر پڑھا کرو ۔ ورنہ چھوڑ دو ۔ مثنوی کا مفہوم اگر نہ سمجھے تو نہ پڑھے'' ۔ اس کے بعد مولوی صاحب کو رخصت کر دیا ۔

اس مرتبہ بالا خانہ پر آ کر مولوی صاحب کچھ عرصہ تک تو ساکت رہے پھر حالت وجد میں مثنوی شریف کا پہلا شعر پڑھا اور جوش میں کھڑے ہو کر رقص کرنے لگے اور یہ ناچ مولوی صاحب ایسا ناچے کہ دیکھنے والے متحیر تھے کہ پہلے تو بالا خانہ پر یہ ناچ ہوتا

رہا پھر اتر کر دولت پر عرصہ تک مولوی صاحب یہ ناچ ناچے ۔پھر قصبہ کی گلیوں میں ناچے پھرے اور بار بار کہتے تھے کہ اب خوب سمجھ گیا۔

چنانچہ اسی صورت سے آٹھ روز گزر گئے اور وہ ناچ ختم نہ ہوا اور اس عرصہ میں مولوی صاحب کو نہ اپنے کپڑوں کا ہوش ہوا نہ کھانے کی فکر ہوئی، نہ پانی کی تلاش اور نہ کسی وقت نماز کا خیال آیا۔ بلکہ یہی ایک شعر کہ:

بشنو از نے چون حکایت میکند
و ز جدائی ہا شکایت میکند

﴿سنو کہ بانسری کس طرح اپنی داستان سناتی ہے اور اپنی جدائی کا شکوہ کرتی ہے﴾

پڑھتے تھے اور بار بار کہتے تھے خوب سمجھ گیا۔ بلکہ کسی نے اگر کہا کہ مولوی صاحب نماز پڑھ لیجئے، تو جواب میں کہتے تھے کہ تم اپنی نماز پڑھو۔ میں پڑھ چکا ہوں اور اب نماز میری یہ ہے۔

سرے در سجدۂ ہر در ندارم
جز این در قبلہ دیگر ندارم

﴿ہر در میں اپنے سر کو سجدہ میں نہیں ڈال دیتا کیوں کہ اس در کے سوا میرا کوئی اور قبلہ نہیں﴾

اور جس وقت زیادہ بیقرار ہوتے تھے تو حالت جوش واضطراب میں زار زار روتے اور کہتے تھے:

قادرا بہر جمال خویشتن برفگن این پردہ از رخ برفگن
تا بخود بینیم خود را در وجود گہ رکوع آریم شادان گہ سجود

﴿اے قادر! اپنے جمال کی خاطر اپنے چہرے سے یہ پردہ ہٹا دے تا کہ میں خود کو وجود میں دیکھ لوں اور خوشی وانبساط سے کبھی رکوع کروں تو کبھی سجدہ﴾

ہر چند مولوی صاحب کی حالت زار کا ہر شخص کو احساس تھا۔ مگر راجہ دوست محمد خان صاحب وارثؔ نے ان کی پریشان حالی پر بار بار افسوس کا اظہار کیا۔ آخر موصوف کے اصرار سے مولوی صاحب کو میں تالاب پر لے گیا اور خوب نہلایا۔ گو ان کے وجد کا خمار غسل سے بھی بالکل فرو نہیں ہوا لیکن اس دوسرے ہفتہ میں رفتہ رفتہ افاقہ ضرور ہوا اور جب کسی قدر سکون ہو گیا تو ایک روز بکمال ادب سرکار عالم پناہ کی خدمت بابرکت میں حاضر ہو کر مولوی صاحب نے عرض کیا کہ واللہ کائنات میں ہر ذرہ آپ ہی کے نور سے معمور ہے یہی نسبت شیخ کو پابند اسلام کرتی

ہےاور یہی صورت برہمن سے رام رام کہلواتی ہے۔ بقول:

از رندے و پارسائے تو
میخانہ و خانقاہ در رقص

﴿تیری پارسائی اور رندگی سے مےخانہ اور خانقاہ دونوں رقصاں ہیں﴾

آقائے نامدار یہ خطا شعار آپ کے کرم اور آپ کی عنایت کا امیدوار ہے۔اب خاطر بیقرار کو تاب انتظار نہیں۔زندگی سے بیزار ہوں۔کیونکہ

خواب زچشم من بشد چشم تو بست خواب من
تاب نماند درتنم زلف تو برد تاب من

﴿میری آنکھوں کے خواب تیری آنکھوں سے منسلک ہیں یعنی تو آنکھ بند کرے گا تو میں خواب دیکھ پاؤں گا۔میرے وجود میں اب کچھ طاقت باقی نہیں کیوں کہ تیری زلف میری توانائی لے گئی ہے۔﴾

لہٰذا مستدعی ہوں کہ اب غلام کو لباس فقر مرحمت ہو اور تعلقات دنیا سے آزاد فرمایئے جناب حضرت نے یہ ارشاد فرمایا کہ۔''تم اپنے مکان جاؤ اور دین کا مدرسہ جاری کرو۔'' مگر جب مولوی صاحب زیادہ مضطر و بیقرار ہوئے تو ارشاد ہوا:''اگر خراب ہی ہونا ہے تو پہلے پورب کی سیر کرو۔''اس فرمان کی تعمیل کیلئے مولوی صاحب فوراً مستعد ہو گئے اور قدمبوس ہو کر پورب کی سمت چلے گئے۔

یہ بھی عجیب واقعہ ہے کہ ایک سنیاسی پٹنہ کے پنجابی درویش آئے اور میرے بستر کے قریب بیٹھ گئے۔میں نے پوچھا کہ سادھو جی کہاں استھان ہے؟

کہا:''بابا امرتسر سے آتا ہوں اور بارہ برس سے اس تلاش میں ہوں کہ کوئی نارائن کا سیوک یہ بتا دے کہ نرنکار اس ہمارے سریر کے اندر ہے یا سریر کے باہر ہے اکثر مہاتماؤں نے سمجھایا مگر افسوس کہ میری تشفی نہ ہوئی۔جب حاجی صاحب بابا کا نام سنا تو اسی خیال سے یہاں بھی بھکاری بن کر آیا ہوں۔''

میں ان کو اندر لے گیا تو اتفاق سے اس وقت حضور کا بستر صحن میں تھا اور آپ کھڑے تھے وہ سادھو جب دروازہ میں داخل ہوا جناب والا کی خدا نما صورت دیکھی۔اسی مقام پر وہ زمین بوس ہوا اور عجیب کیفیت کے عالم میں اُفتاں وخیزاں قریب جا کر پاؤں پر سر رکھ دیا۔سرکار عالم پناہ نے مجھ کو یہ حکم دیا کہ ان کو ٹھہراؤ اور ان کے کھانے کا انتظام کر دینا۔

باہر آ کر میں نے کہا کہ سادھو جی تم نے کچھ دریافت نہ کیا۔ وہ آبدیدہ ہو کر کہنے لگے کہ بغیر دریافت کئے جواب مل گیا۔ جس وقت دروازہ کھلا تو میں نے بابا کی صورت کی ایک جوت دھرتی سے آکاش تک دیکھی اور جب گرو جی کے چرن میں سر دیا تو جسم بشری پایا۔ بس میری تسکین ہوگئی اور جو آج تک نہ سمجھا تھا وہ سمجھ گیا۔

یہ بھی دیکھا کہ اکثر طالبین لباس فقر کی استدعا منظور بھی فرمائی ہے اور بعد کو معلوم ہوا کہ نامنظور اس وجہ سے ہوئی کہ ان کی طلب صادق اور خالصاً لوجہ اللہ نہ تھی بلکہ کسی غرض پر مبنی تھی۔ چنانچہ ایک شخص نیپال کا باشندہ حاضر خدمت ہوا اور ملتجی ہوا کہ مجھ کو تہبند مرحمت ہو۔ بیساختہ حضور نے فرمایا کہ پہلے اپنی جورو کو رضامند کر آؤ۔ جب وہ باہر آیا اور اس سے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ جورو سے لڑ کر آیا تھا اور اس رنج کی وجہ سے وہ فقیر ہونا چاہتا تھا لیکن ہمارے حقیقت شناس پیشوا نے اس کی باطنی حالت پر نظر فرمائی اور تہبند نہیں دیا کیونکہ محض اس خانگی رنجش کے باعث اس نے ترک لباس کا ارادہ کیا تھا۔ خدا کی طلب نہ تھی۔ چنانچہ ایسے واقعات اور بھی گذرے ہیں کہ اکثر حضرات کسی صدمہ کی وجہ سے ترک لباس کرنے پر آمادہ ہوئے مگر حضور نے ان کو تہبند نہیں دیا اور جب کچھ عرصہ کے بعد اس اندوہ والم کا ازالہ ہوگیا تو پھر بدستور وہ اپنے کاروبار میں مصروف ہو گئے اور برخلاف اس کے جن کی طلب تھی ان کو تہبند بھی ملا اور ان کی حالت میں تغیر بھی نہیں ہوا۔

اسی دوران میں سلسلہ صابریہ کے ایک معمر شخص درویش صورت ضلع ایٹہ سے آئے اور رحیم شاہ صاحب کے کمرہ کے باہر سائبان میں ٹھہرائے گئے لیکن چار پانچ روز تک وہ اپنے بستر پر بیٹھے رہے جناب حضرت کی خدمت میں بھی نہیں حاضر ہوئے رحیم شاہ صاحب نے مجھ سے کہا کہ دریافت کرو یہ کون ہیں اور کیوں مقیم ہیں۔ میں ان کے بستر پر گیا تو دیکھا ایک مطبوعہ کتاب اردو کی ان کے ہاتھ میں ہے اور چند اہل دیہات معمولی طبقہ کے ان کے پاس بیٹھے ہیں اور شاہ صاحب سیر وسلوک کے قواعد ان کو سمجھا رہے ہیں اور درمیان تقریر میں یہ بھی فرماتے جاتے ہیں کہ یہاں کوئی شخص نہ یہ نکات جانتا ہے اور نہ ان مقامات سے واقف ہے اور مرشد کی عنایت سے میں سب منازل سلوک طے کر چکا ہوں۔ بلکہ بہت بڑا مقام جس کا نام لاہوت ہے میں اس کی سیر کرتا ہوں۔ بقول:

مرغ شاخ درخت لاہوتیم
گوہر درج گنج اسراریم

﴿میں شجر لاہوت کی شاخ کا پرندہ ہوں اور رموز و اسرار کے خزانے سے ایک موتی ہوں۔﴾

پہلے تو میں بھی ان کی روحانی تعلیم خاموشی کے ساتھ سنتا رہا۔ جب ان کے اس طرز و طریق سے ظاہر ہو گیا کہ شاہ صاحب اپنی ذاتی ضرورتوں کو پورا کرنے کیلئے عوام الناس کو اپنی حقانیت باطنی سے آگاہ کرتے ہیں اور چونکہ اس کام میں شب و روز مصروف رہتے ہیں۔ اس لحاظ سے سرکار کی خدمت میں حاضر ہونے کا وقت ان کو نہیں ملتا۔

بالآخر میں نے کہا کہ جناب شاہ صاحب! اگر تکلیف نہ ہو تو اپنے طے کردہ مقامات کا نام تو بتایئے۔ شاہ صاحب نے نہایت کشادہ پیشانی سے یہ فرمایا کہ صاحبزادے کیا آج تک تم نے سنا بھی نہیں کہ طریقت میں مقامات فقر کے نام کیا ہیں۔ اگر تم کو شوق ہے تو میں تم کو سمجھائے دیتا ہوں یاد رکھو کہ اول مقام ناسوت، دویم ملکوت، سویم جبروت، چہارم لاہوت ہے جن کو یکے بعد دیگر میں طے کر چکا ہوں اور وہی مطبوعہ کتاب دکھا کر فرمایا کہ اس میں بھی انہیں مقامات کی تصریح درج ہے اگر زیادہ اطمینان منظور ہو تو اس کو پڑھ لو۔

میں نے عرض کیا کہ جناب شاہ صاحب افسوس ہے کہ جس منزل کا طے کرنا لازمی اور ضروری تھا اور جس مرحلہ کو بغیر طے کئے کاملین میں شمار نہیں ہو سکتا۔ وہی مقام آپ سے چھوٹ گیا۔ ورنہ اسقدر نورانیت آجاتی کہ آپ ہوا پر اڑنے لگتے۔ شاہ صاحب نے گھبرا کر فرمایا کہ وہ کون سا مقام ہے۔ میں نے کہا کہ اس مشہور و معروف مقام کا نام منزل کہاوت ہے۔ جس مسافر راہ سلوک نے یہ دشوار گزار مقام طے کر لیا ہے اس کو سب منزلیں آسان ہو جاتی ہیں۔ ہر چند سالک مقام کہاوت کے نورانی چہرہ پر پہلے فنائیت کے آثار ظاہر ہوتے ہیں۔ مگر آخر میں بقا کا مرتبہ اس کو ملتا ہے اور مکان تمکین میں پر تکلف مسند پر بیٹھ کر وہ حقہ پیتا ہے اور بکمال اطمینان بھیروین کی دھن میں کہتا ہے:

فنا کیسی بقا کیسی جب اس کے آشنا ٹھہرے
کبھی اس گھر میں آ ٹھہرے کبھی اس میں جا ٹھہرے

شاہ صاحب نے متحیر ہو کر فرمایا کہ آج تک اس مقام کا نام بھی نہ کسی فقیر سے سنا اور نہ اس کتاب میں منزل کہاوت کا ذکر ہے۔ میں نے کہا جناب رموز و اسرار روح سفینہ نہیں ہوتے۔ بلکہ یہ علم سینہ ہے جو بغیر خدمت کے نہیں حاصل ہوتا۔ بقول:

ہر کہ خدمت کرد اُو مخدوم شد
ہر کہ خود را دید اُو محروم شد

﴿جو کوئی خدمت کرتا ہے مخدوم ہو جاتا ہے اور جو اپنی ہی ذات کے سحر میں مبتلا رہتا ہے محرومی اس کا مقدر بن جاتی ہے۔﴾

چنانچہ میں نے برسوں خاک چھانی۔ تب بڑی جانفشانی سے اس مقام عالی کو طے کیا ہے۔ ہر کس و ناکس کی مجال نہیں کہ منزل کہاوت طے کرنے کا خیال بھی کرے اور آپ کی تنگ ظرفی سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کوچہ میں قدم رکھنا بھی آپ کو محال ہے۔ البتہ کسی باکمال شخص کی مسلسل خدمت کیجئے اور اگر افضال الٰہی بھی شامل حال ہوا تو شاید صحرائے کہاوت کی ٹھوکریں کھانا آپ کو نصیب ہوں۔ ورنہ اس بحر ذخار سے پیراپار ہونا بہت دشوار ہے۔ کیا یہ مشہور مقولہ آپ نے سنا نہیں:۔

درین ورطہ کشتی فروشد ہزار
کہ پیدا نشد تختہ بر کنار

﴿حیرت کے اس سمندر میں ہزاروں کشتیاں کچھ اس طرح غرق ہوگئیں کہ ان میں سے کسی کا ایک تختہ تک باہر نہیں آیا۔﴾

یہ کہہ کر میں تو اپنے بستر پر چلا گیا۔ مگر شاہ صاحب کو منزل کہاوت کی سیر کا اس قدر شوق ہوا کہ جناب شاہ فضل حسین صاحب اور معروف شاہ صاحب اور شیدا میاں کے پاس بار بار گئے اور ان سے باصرار کہا کہ آپ سفارش کردیں کہ اوگھٹ شاہ مجھ کو منزل کہاوت طے کرادیں۔ ان لوگوں نے بطور مذاق شاہ صاحب کو یہ سمجھایا کہ ہم بھی آپ کی سفارش کریں گے۔ مگر بہترین صورت یہ ہے کہ آپ جناب حاجی صاحب قبلہ کی خدمت میں حاضر ہو کر یا استدعا کریں۔ قرینہ ہے کہ آپ کی خاطر قبلہ عالم ان کو ضرور یہ حکم دیں گے کہ ان کو منزل کہاوت طے کرادو اور پھر اوگھٹ شاہ کی مجال نہیں کہ کوئی عذر کریں اور آپ کامیاب ہو جائیں گے۔

چونکہ منزل کہاوت کے شوق نے شاہ صاحب کو از خود رفتہ کردیا تھا اسلئے ''دیوانہ را ہوئے بس است''۔ کا مضمون ہوا کہ ان کو بھی یہ صلاح پسند آئی اور اسی وقت سرکار عالم پناہ کی خدمت میں حاضر ہو کر مستدعی ہوئے کہ للہ حکم فرمائیے کہ اوگھٹ شاہ مجھ کو منزل کہاوت طے کرادیں۔ حضور نے مجھ کو طلب فرما کر شاہ صاحب کا قصہ سنا اور مسکرا کر ارشاد ہوا کہ اگر تم کو معلوم ہو تو منزل کہاوت طے کرادو۔

میں نے باہر آ کر شاہ صاحب سے اقرار لیا کہ جو کہوں گا اس کی تعمیل کرنا ہوگی اس گرویدۂ مقام کہاوت نے جب اس کو بھی قبول کیا تو میں نے یہ تلقین کی کہ آج سے نصف روٹی

صبح کو اور نصف شام کو کھایا کرو۔ شاہ صاحب نے وفور شوق میں ایسا ہی کیا لیکن اسی کے ساتھ میں نے بھی اس روز سے نصف ہی روٹی پر قناعت کی۔ اسی ہفتہ میں شاہ صاحب کو اس مجاہدہ نے ایسا ضعیف کر دیا کہ نشست و برخاست میں تکلف ہونے لگا۔ جب ان کا یہ حال دیکھا تو مجھ کو خیال ہوا کہ دگی میں صورت ملال نہ پیش آوے۔ اسی وقت جناب حضرت کی خدمت میں ان کو لے گیا اور عرض کیا کہ یہ مقام کہاؤت طے کر آئے۔ حضور نے ذکر اسم ذات جلالی قاعدہ سے ان کو تعلیم کیا اور فرمایا ''شاہ جی اب جاؤ''۔

شاہ صاحب اسی روز چلے گئے۔ مگر بعدہٗ ضلع ایٹہ کے بعض حضرات سے معلوم ہوا کہ شاہ صاحب نے یہاں سے جا کر جملہ تعلقات منقطع کر دیئے اور جنگل میں آزادانہ زندگی بسر کرتے ہیں اور ہر وقت وجدانی حالت رہتی ہے اور اکثر ذکر اسم ذات بالجہر کرتے ہیں۔

اس واقعہ سے ایک سبق یہ ملا کہ باوجودیکہ یہ قصہ سراپا مذاق تھا اور شاہ صاحب کو حضور کی خدمت میں حاضر ہونے کا مشورہ بھی مذاق ہی کے پیرایہ میں دیا گیا تھا کہ یہ جا کر مقام کہاؤت کا اشتیاق ظاہر کریں اس تذکرہ سے چند منٹ کیلئے حضور کی دلبستگی ہوگی اور ایسا ہی ہوا کہ شاہ صاحب کی یہ طلب سنکر حضور مسکرائے بھی لیکن اس مذاق کی رسائی چونکہ دربار وارثی میں ہو گئی تھی اس لئے یہ مذاق بھی وہاں پہنچ کر مذاق نہ رہا اور تصرت وارثی سے یہ مذاق بھی ''صحبت صالح ترا صالح کند'' کا مصداق ہو گیا۔ بقول:

سعادت ابدی در پئے ارادت تست
چنانکہ عید مبارک ز بعد ماہ صیام

﴿جس طرح روزوں کے بعد عید آتی ہے اسی طرح ابدی سعادت تیرے ارادے سے منسلک ہے۔﴾

فیضان صحبت وارثی نے طالب کہاؤت کی بھی ہدایت فرمائی اور نسبت وارثی کے حقیقی اثر نے یہ کرشمہ دکھایا کہ: ''آگ لینے کو جائیں پیمبری ہو جائے''۔ کا مضمون ہوا۔ اس غیور شہنشاہ کو منظور ہوا کہ ہمارے فیض عام سے سادہ لوح بھی محروم نہ جائے بظاہر ایک ذکر بھی تعلیم فرمایا اور باطنی تصرف سے ترک تعلقات کا دشوار گزار مرحلہ ایسا سہل کر دیا کہ بہ آسانی دنیا کے دام تزویر سے رہا ہو کر وہ ہا بلدرا فقر بھی ویران جنگل میں مسکن گزیں ہوا ''ذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَاءُ''

ایک روز قریب عصر ہندو فقراء کے لباس میں ایک صاحب آئے اور اسی انداز کا مختصر

اسباب بھی ان کے ساتھ تھا۔ اتفاق سے میں اس وقت دراقدس پر حاضر تھا۔ ملنے کے بعد یہ فرمائش کی کہ جلد قدمبوسی کرادو۔ ابھی واپس جاؤنگا میں نے عجلت کا سبب پوچھا تو اضطراری حالت میں یہ بیان کیا کہ مجھ کو معلوم ہوا ہے کہ سب کا حصہ تقسیم ہو رہا ہے۔ لہذا میں بھی آقائے نامدار کے دراقدس پر اپنا حصہ لینے حاضر ہوا ہوں۔ اسلئے عرصہ نہ ہونا چاہیے۔ میں اسی وقت بارگاہ وارثی میں ان کو لایا۔ ہنوز وہ دالان کے پاس نہیں پہنچے تھے کہ سرکار عالم پناہ نے دیکھ کر فرمایا کہ۔ ''اچھا جاؤ''۔ یہ فرمان سنکر اسی جگہ وہ زمین بوس ہو کر واپس آئے اور اپنا اسباب اٹھا کر درگاہ کی جانب چلے گئے۔

اسی وقت اٹھا کر پنچم سنگھ صاحب نے آکر یہ قصہ سنا تو موصوف کو شوق ہوا کہ ان کا حال مفصل دریافت کرنا چاہیے۔ چنانچہ اسی خیال سے اٹھا کر صاحب اور میں درگاہ میں آئے تو دیکھا وہ صاحب نماز پڑھ کر جانے کو ہیں۔ اٹھا کر صاحب نے روکنا چاہا۔ مگر انھوں نے معذرت کے ساتھ کہا کہ میں ممالک متوسط کا باشندہ ہوں مالک نے میرا حصہ دیکر مجھ کو رخصت کر دیا ہے۔ ایسی حالت میں مجال نہیں کہ قیام کرنے کا خیال بھی کروں اور مل کر فوراً چلے گئے۔

علی ہذا میرے ماموں حاجی اشفاق حسین صاحب کے خیالات میں جس قدر تغیرات ہوئے وہ بھی خاص تصرفات وارثی کا کرشمہ تھا۔ کیونکہ وہ مولانا حاجی امداد اللہ مہاجر مکی علیہ الرحمۃ کے مرید تھے اور علمائے دیوبند کی تقلید کے ہمیشہ پابند رہے۔ نہ کبھی صوفیائے کرام کی تبیعت کی نہ فقرائے عظام کی عظمت ان کی نگاہ میں تھی۔ چنانچہ قادر شاہ صاحب وارثی جو پچھرایوں میں عرصہ سے قیام پذیر تھے ماموں صاحب ان کے بھی قطعی خلاف تھے۔ جب وہ علیل ہوئے تو میری وجہ سے اس قدر رعایت کی کہ اپنی کوٹھی میں لاکر ان کا علاج کرادیا۔ مگر چوں کہ بدظن بہت تھے۔ اس لحاظ سے خود ان کی تیمارداری میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ بلکہ ان کو حقیر سمجھ کر اس گوشہ میں جگہ دی جس میں کاشتکاری کا سامان رہتا تھا۔

لیکن قادر شاہ صاحب کی مدت حیات قریب اختتام تھی۔ علاج بھی مفید نہ ہوا اور جب احتضار کا وقت آیا تو ماموں صاحب کا بیان ہے کہ مسافر سمجھ کر میں ایک آن واحد کیواسطے ان کے قریب گیا تو یہ تماشا دیکھا کہ جس قدر ان کا لباس اور بستر بوسیدہ اور کثیف تھا۔ اسی قدر انکا چہرہ نورانی اور وہ تاریک کمرہ روشن تھا اور نہایت پسندیدہ خوشبو آرہی تھی اور ہر سانس کے ساتھ ذکر اسم ذات جاری تھا۔ مجھ کو عبرت ہوئی اور فوراً خیال آیا کہ آج ان کی یہ شان وعظمت صرف حاجی صاحب کی غلامی کی بدولت ہے۔ میں نے یہ بھی پوچھا کہ کچھ کہنا ہے۔ تو شاہ

صاحب نے بکمال صبر وتحمل جواب دیا کہ تم سے کیا کہیں جو ہمارا سننے والا ہے اس سے جو کہنا ہے وہ کہہ رہے ہیں۔ تمھارا یہ کام ہے کہ جب روح نکل جائے تو اس مٹی کو جہاں چاہے دبا دینا اور ہم تو حاجی صاحب کے پاس رہیں گے۔ اس گفتگو کے بعد خاموش ہوئے اور زیادہ وقفہ نہیں گزرا تھا کہ ان کا انتقال ہو گیا۔

یہ حیرت خیز واقعہ دیکھ کر ماموں صاحب کی حالت متغیر ہوئی حتی کہ اسی اضطراری کیفیت میں دیوی شریف آئے اور مجھ سے فرمایا کہ مرید کرادو۔ میں نے ہر چند سمجھایا کہ آپ حاجی امداد اللہ صاحب کے دست گرفتہ ہیں۔ اب اس کی ضرورت نہیں کہ یہاں بھی بیعت کیجئے۔ مگر اسقدر بیقرار تھے کہ بار بار اصرار کیا۔ آخر مجبور ہو کر جناب حضور کی خدمت بابرکت میں ان کو لیا گیا اور عرض کیا کہ یہ میرے ماموں حاجی امداد اللہ صاحب کے مرید ہیں اور آج آپ سے طالب ہونا چاہتے ہیں۔ سرکار عالم پناہ نے فرمایا: ''ہم اور امداد اللہ دو نہیں ہیں۔ بلکہ ہم اور وہ ایک ہیں''۔ ماموں صاحب نے نہایت پر حسرت لہجہ میں عرض کیا کہ قبلہ عالم دوبارہ ہاتھ پکڑنا چاہتا ہوں اس وقت حضور نے اپنا ہاتھ ان کے ہاتھ میں دیا اور فرمایا: ''دیکھو یہی امداد اللہ کا ہاتھ ہے ہم سے بھی محبت رکھو'' اور دو روز کے بعد رخصت کر دیا۔

ماموں صاحب سے بعض ان کے احباب نے دریافت بھی کیا کہ آپ مکرر کیوں مرید ہوئے تو ماموں صاحب نے یہی جواب دیا کہ اول تو اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ جناب حاجی صاحب کے مرید کا انجام اچھا اور بہت اچھا ہوتا ہے۔ جیسا کہ قادر شاہ صاحب کا ہوا۔ حالانکہ مجھے انکے ساتھ سوء ظن تھا۔ مگر ان کا خاتمہ ایسا دیکھا کہ مجھے ندامت ہے کہ ایسے خوش انجام شخص سے مجھے خصومت تھی۔ آج تک متحیر ہوں کہ ان کے انتقال کے وقت وہ کمرہ منور اور معطر کیوں ہو گیا تھا اور ان کی تجہیز وتکفین میں اس قدر مجمع کیوں ہوا اور یہ لوگ کہاں سے آئے۔ سوائے اس کے کہ جناب حاجی صاحب قبلہ کی غلامی کا شرف تھا جس کا آخر وقت اس اقتدار کے ساتھ اظہار ہوا۔

دوئم یہ کہ رضا وتسلیم کی تکمیل کامل حاجی صاحب قبلہ نے اس خوبی سے فرمائی کہ جو اپنی نظیر آپ ہے۔ چنانچہ دیوی شریف میں جا کر معلوم ہوا کہ درحقیقت زہد واستقامت اس کو کہتے ہیں کہ جو کپڑا جسم اطہر پر ہے وہ بھی اپنا نہیں۔ اگر کسی نے تہبند پیش کیا تو اس کو باندھ لیا اور جو باندھے تھے وہ اس کو دے دیا۔ یہی صورت بستر کی ہے کہ ایک آتا ہے اور ایک جاتا ہے۔ علی ہذا۔ مکان بھی اپنا نہیں، کھانا بھی دوسرا شخص لاتا ہے اور کھلا جاتا ہے غرض یہ کہ نہ گھر ہے نہ در، نہ

حساب ہے نہ کتاب، نہ عزیز ہیں نہ اقارب، نہ رشتہ دار، نہ کسی جھگڑے سے سروکار۔ واقعی انقطاع حقیقی اسی کا نام ہے کہ بجز ذات واحد الوجود کائنات میں کسی سے کام نہیں۔

چنانچہ حضور کی بیعت کے بعد ماموں صاحب اسقدر خوش عقیدت ہو گئے تھے کہ تا زندگی فقراء کی خدمت بھی کی اور ان کی عظمت کی نگاہ سے دیکھا جس کا عوض یہ ملا کہ خاتمہ کلمہ طیبہ کے ساتھ ہوا۔ جیسا کہ حضور نے متواتر فرمایا ہے کہ ''عاشق کا مرید بے ایمان نہیں مرتا۔''

اسی دوران میں مضافات جیپور کے ایک نوجوان طالب فقر کو سرکار عالم پناہ نے تہبند اور لنگوٹ مرحمت فرمایا اور ان کا نام نبی شاہ رکھا۔ چونکہ یہ درویش مجھ کو مضبوط خیال کے معلوم ہوئے تو خدمت عالی میں عرض کیا کہ حضور اگر ان کا قیام قادر شاہ کی کٹیا پر ہو جائے تو وہ آباد رہے۔ جناب حضرت نے یہ استدعا قبول فرمائی اور نبی شاہ کو یہ حکم دیا کہ ''تم پچھرایوں میں قادر شاہ کی قبر پر رہا کرو۔'' چنانچہ آجتک نبی شاہ صاحب جب سے سیاحت سے واپس آئے ہیں تو قادر شاہ صاحب کی کٹیا پر رہے ہیں اور نہایت صبر و استقلال سے زندگی بسر کرتے ہیں اور بکمال احتیاط پابند وضع ہیں۔

الغرض تصرفات وارثی کی ایک شان یہ بھی دیکھی کہ خود تو بظاہر کوئی ہدایت نہیں فرمائی لیکن دوسرے کی زبان سے ایسے الفاظ ان کو سنائے گئے کہ وہ مطمئن ہو گئے چنانچہ ایک معمر اور مقدس اور ذی علم شخص ضلع میرٹھ سے بغرض حصول بیعت در دولت پر حاضر ہوئے لیکن حجاب علم کے سنگین نقاب نے ان کی چشم طلب کو حقائق و معارف کے مشاہدے سے معذور رکھا اور تشکیک و اوہام کی دیوار ایسی سد راہ ہوئی کہ تین روز آستانہ اقدس پر قیام کیا۔ مگر نہ تخیلات نے ان کو بیعت کی اجازت دی اور نہ قطعی طور ارادت سے انحراف کرنے کی ان کو جرأت ہوئی۔ بلکہ اس کشمکش نے ایسی مہر خاموشی لگادی کہ اپنے شکوک کا اظہار بھی نہ کر سکے لیکن حضور اقدس مولوی صاحب کے حال پر غیر معمولی عنایت فرماتے تھے چنانچہ چوتھے روز بعد مغرب مولوی صاحب قدمبوسی کیلئے حاضر ہوئے تو حضور نے فرمایا کہ'' مولوی صاحب بیٹھو'' اور حسب معمول شیدا میاں سے فرمایا کہ کوئی تاریخی تذکرہ بیان کرو۔ خدام حیران تھے کہ آج یہ بات خلاف معمول کیوں ہوئی۔ اسلئے کہ یہ وقت دربار خاص کا ہے۔ مولوی صاحب کیوں بٹھائے گئے۔ مگر اس کی خبر نہ تھی کہ رنگ توہمات سے مولوی صاحب کے خیالات میں جو تکدرات آ گئے ہیں ان کی صیقل ہوگی۔

چنانچہ حسب الحکم شیدا میاں نے محمود غزنوی کے عہد میں ایک امیر زادہ کو اس کے

مرشد کامل نے عشق حقیقی کی جو ہدایت کی تھی اس کو بہ تفصیل بیان کیا اور آغاز اس تذکرہ کا حدیث ''اَلْیَوْمُ اَخُ الْمَوْت '' سے ہوا اور مسائل عشق و محبت کی تصریح کبھی کسی آیہ کریمہ اور کبھی کسی حدیث صحیح سے کی اور بزرگان سلف کے اقوال سے استدلال کیا اور اظہار مقصد کیلئے مثنوی شریف کے بعض اشعار بھی برجستہ پڑھے اور نہایت مسلسل طریق سے دو گھنٹہ کی اس تقریر کا نتیجہ ''مُوْتُوْا قَبْلَ اَنْ تَمُوْتُوْا'' سے نکالا اور آخر میں مولانا علیہ الرحمۃ کا یہ شعر

خوشتر آن باشد کہ سر دلبران
گفتہ آید در حدیث دیگران

﴿جس کی بات محبوبوں کی محفل میں دوسروں کی حکایت میں بیان ہوتی ہے وہ بہت خوش نصیب ہوتا ہے۔﴾

پڑھ کر قصہ ختم کیا۔ اس وقت حضور نے مولوی صاحب سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ ''مولوی صاحب اب جاؤ''

مولوی صاحب نے آہ کی اور مثل ماہیٔ بے آب تڑپنے لگے اور نہایت پر درد لہجہ میں کہا:

کے توانی شد ظہورے نیک نام
تا نہ سازی خویش را بد نام عشق

﴿جب تک تو اپنے آپ کو عشق میں بدنام نہیں کرے گا۔ نیک ناموں میں شمار نہیں ہو سکتا۔﴾

اور اسی حالت میں حضور کے سامنے دست بستہ کھڑے ہو کر عرض کیا۔

کسیکہ روئے تو بیند حدیث گل نکند
کسیکہ مست تو شد آرزوئے مل نکند

﴿جس کسی نے تیرا چہرہ دیکھا ہے وہ پھول کی بات نہیں کرتا اور جو تیری آرزو میں مست ہے اس مے کی ضرورت نہیں﴾

خداوند نعمت میری خراب قسمت نے تین روز تک اس سعادت سے محروم رکھا۔ آپ اہل بیت کرام علیہم الصلوۃ والسلام کے فرزند اور قائم مقام ہیں۔ واللہ

اے سید پاک و پاک زادہ ہر آئینہ داد حسن دادہ

اے سید پاک اور پاک زاد ہر آئینہ آپ کے جمال کی تحسین کرتا ہے۔

در پیش قد کشیدۂ تو سرو چمن است ایستادہ

آپ کی قامت کے سامنے باغ کا سرو ہاتھ باندھے کھڑا ہے۔

از روئے تو کافتاب حسن است شوریست درین جہاں فتادہ

آپ کے چہرے سے سورج کی تابندگی ہے اور جہاں میں یہی شور برپا ہے۔

آرے سرزلف و گیسوانت بوئے بہ نسیم صبح دادہ

جی ہاں آپ ہی کی عنبریں زلفوں سے نسیم سحر مہک حاصل کرتی ہے۔

خدا کی واسطے بمصداق ''وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ''۔میرا قصور معاف ہو اور حلقہ غلامی میں داخل فرمایئے جناب حضرت نے ان کی بیعت لی ۔متبسم لبوں سے فرمایا:''مولوی صاحب اب رات کو نہ سونا''اور دوسرے روز ان کو رخصت کر دیا۔

علی ہذا قاضی بخشش علی صاحب نے اپنی ارادت کا واقعہ یہ بیان کیا ہے کہ ۱۳۰۳ ہجری میں مولوی مظفر حسین صاحب وارثی کے ہمراہ بارہ بنکی سے قصبہ سہالی کو میں جا رہا تھا۔چونکہ مولوی صاحب حضور والا کے قدیم حلقہ بگوش تھے اسلئے جب ہمارا یکہ دیوئی شریف پہنچا تو صاحب موصوف شوق قدمبوسی میں مجھ کو بھی ہمراہ لیکر سرکار عالم پناہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور زمین بوس ہو کر مؤدب بیٹھ گئے میں نے دیکھا کہ اسی اثنا میں بیک وقت دس بارہ اشخاص طالب بیعت آئے اور حضور نے معمولی طور پر مرید فرما کر ان کو رخصت کر دیا۔مجھ کو خدشہ ہوا کہ آپ نے بغور کسی کو دیکھا بھی نہیں۔قیامت کے روز یہ اپنے مریدوں کو کیونکر پہچانیں گے اور سفارش کس کی کریں گے۔لہذا ان کی بیعت کرنا قطعی بیکار اور بالکل منفعت سے خالی ہے۔اسی عرصہ میں سرکار عالم پناہ نے مولوی صاحب کو رخصت کیا اور مجھ سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ''تم تو پھر آؤ گے''۔مجھ بداعمال نے حضور کے اس فرمان کا مطلق خیال بھی نہ کیا بلکہ دل میں کہا کہ مجھے کیا ضرورت ہے جو پھر آؤنگا۔

غرض اسی وقت ہم دونوں دیوی شریف سے چلے اور شام کو سہالی پہنچ گئے تین روز کے بعد جب وہاں سے واپس چلے اور سواری کی تلاش میں مہگاواں شریف کی جانب سے فتحپور کی پختہ سڑک پر آئے اور یہاں بھی انتظار کیا مگر سواری نہ ملی تو مولوی صاحب نے کہا پینڈ کے جنگل میں ہمارے پیر بھائی خدا بخش شاہ رہتے ہیں۔ہر چند ملاقات نہیں ہے۔مگر اتفاق سے جب یہاں تک آ گئے ہیں تو ان سے بھی ملتے چلیں۔

چنانچہ موضع پینڈ میں پہنچ کر دریافت کیا اور خدا بخش شاہ صاحب کی قیام گاہ پر پہنچے تو یہ دیکھا کہ ایک دہقانی شخص بوسیدہ تہبند باندھے درخت کے نیچے بیٹھا حقہ پی رہا ہے۔مولوی

صاحب نے سلام کیا تو بشاش ہو کر شاہ صاحب کھڑے ہو گئے اور نہایت خلوص و محبت کی ساتھ آؤ بھائی کہہ کر مولوی صاحب سے معانقہ کیا اور مجھ سے معمولی طریقہ سے صرف مصافحہ کیا۔ مگر مولوی صاحب کی مدارات میں ان کو خاص انہماک تھا جس سے دلی مسرت کا صاف اظہار تھا۔

شاہ صاحب کی میری نسبت یہ بے التفاتی مجھ کو ناگوار ہوئی اور تر شرو ہو کر میں نے شکایت کی کہ شاہ صاحب فقیری کا دعوی بھی آپ کرتے ہیں اور اخلاق محمدیؐ سے اسقدر ناواقف اور بے خبر۔ یہ تفریق آپ کو کس نے سکھائی کہ ایک مہمان کے ساتھ یہ اتحاد اور ایک کے ساتھ یہ بد خلقی۔ افسوس۔

ہر چند یہ شکایت تو کی مگر خیال تھا کہ میری یہ سخت کلامی شاہ صاحب کو ضرور ناخوش کر دے گی۔ لیکن قضیہ اس کے برعکس ہوا کہ شاہ صاحب بہ کمال متانت ہنس کر کہنے لگے کہ میاں صاحبزادے برا نہ مانو۔ یہ ہمارے بھائی ہیں اور تم غیر ہو۔ یہ ہمارے مالک کی زندہ یادگار ہیں اور تم کو دربار وارثی سے کوئی حقیقی سروکار نہیں۔

مجھ کو تعجب ہوا اور استفسار کیا کہ یہ آپ نے کیونکر جانا کہ میں غیر ہوں اور آپ کے بھائی ہیں کیونکہ حیثیت ہماری ایک ہے۔ ان سے بھی آپ ناشناہیں اور مجھ سے بھی ناواقف۔ پہلا موقعہ ہے جو ہم دونوں کو نیاز حاصل ہوا ہے۔ شاہ صاحب نے فرمایا کہ بابا یہ کیونکر سمجھاؤں۔ اسلئے کہ تم کو تو اسی کا یقین نہیں کہ ہمارا مالک اپنے مریدوں کو کیونکر پہچانے گا۔ مگر غور کرو کہ اس پیشوائے ذی احتشام کے ادنیٰ غلام جب یار و اغیار کو پہچانتے ہیں تو ہمارے آقائے نامدار کی تو پڑی سرکار ہے۔

شاہ صاحب کی یہ عارفانہ تقریر میرے امراض باطنی کے حق میں اکسیر ہو گئی۔ دل نے اپنی جہالت کا فوراً اعتراف کیا اور عظمت وارثی کا ایسا انکشاف ہوا کہ میں نے ندامت سے سر جھکا کیا اور رعب حق سے مرعوب ہو کر خاموش ہو گیا۔ ایک گھنٹہ کے بعد مولوی صاحب نے شاہ صاحب سے رخصت طلب کی تو موصوف فرط محبت سے ایسے بیقرار ہوئے اور زار زار رونے لگے اور اصرار کرتے رہے کہ آج نہ جاؤ لیکن مولوی صاحب نے شاید میری جہت سے معذرت کی اور وہاں سے ہم دونوں پھر پا پیادہ چلے۔

پختہ سڑک پر آ کر مولوی صاحب سے میں نے اپنی حالت بیان کی اور مستدعی ہوا کہ دیوئی شریف چلو اور آج ہی حلقہ غلامی میں داخل کرا دو۔ مولوی صاحب نے میری اس خواہش پر

مرحبا کہا۔اور قریب عصر دیوہ شریف پہنچ کر بارگاہ وارثی میں حاضر ہوئے اور سرکار عالم پناہ سے میری سفارش کی۔حضور نے مسکرا کر فرمایا:''آ گئے! جب تک دور تھے دور تھے اب ہمارے پاس رہیں گے''اور میری بیعت لی۔

اس واقعہ سے صاف ظاہر ہوگیا کہ فیضان وارثی نے کس کس طریقہ سے مخلوق الٰہی کی ہدایت فرمائی اور کیسی خوبی سے ان کے خدشات رفع کئے کہ آئندہ خیالات میں شکوک کی گنجائش نہ رہے ورنہ قاضی بخشش علی صاحب کی تعلیم دوسرے عنوان سے بھی ممکن تھی۔مگر نہیں۔اس طبیب باطنی نے ان کے مرض کا علاج اس نسخہ سے کیا جس نے اسباب مرض کو ہمیشہ کیلئے زائل کردیا اور ان کا یہ شبہ کہ جناب حضرت مریدین کی شناخت کیونکہ فرمائیں گے یوں رفع کردیا کہ اپنے ایسے غلام سے مقابلہ کرادیا جس کے صحیح اندازہ نے بغیر تعارف ایک نظر میں یار وا غیار کا امتیاز کرلیا اور قاضی صاحب کے شکوک وتخیلات کی کافی اصلاح ہوگئی۔

اس واقعہ سے ایک سبق یہ بھی ملتا ہے کہ اخوان ملت کو اسی طرح باہمی انس ومحبت رکھنا لازمی ہے۔جس طرح خدا بخش شاہ صاحب کی شفقت برادرانہ کا اظہار ہوا اور باوجود نا آشنا ہونے کے مولوی مظفر حسین صاحب کی پہلی ملاقات میں خلوص واتفاقات کے ساتھ مدارات کی۔بلکہ تھوڑا غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بارگاہ وارثی کے قدیم حلقہ بگوش جس طرح دیگر صفات میں ہم سے ممتاز تھے۔اسی طرح یہ صفت بھی ان میں خاص طور پر نمایاں پائی جاتی ہے اور واقعی وہ پاک نہاید باہمی ارتباط واتحاد میں یگانہ روزگار تھے اور ان کے واقعات ضرور یادگار رہیں گے۔

چونکہ وہ حق شناس اہل تصدیق تھے اور پیشوائے برحق کی ہدایت کے مطابق ان کا یہی طریق تھا کہ باہمی انس ومحبت کو دستور مشرب کی شق قطعی جانتے تھے۔کیونکہ سرکار عالم پناہ نے متواتر فرمایا ہے:''بھائی بھائی میں باہمی محبت ہونا اس کی دلیل ہے کہ ان کو باپ سے محبت ہے''۔

حضور کا یہ ارشاد جو غلاموں کیلئے باہمی اتحاد کا صریحی حکم ہے اس کو اگر نظر تعمق سے دیکھا جائے تو شارع اعظم ﷺ کی ہدایت کا لفظی ترجمہ ہے کیونکہ حضرات محدثین کا اتفاق ہے کہ جناب رسول کریم علیہ التحیۃ والتسلیم نے اخوت اسلامی کے قیام واستحکام کے واسطے تاکیدا کید فرمائی اور انصار ومہاجرین نے اس زرین ہدایت کی تعمیل جس خلوص وخوبی سے کی وہ اپنی نظیر آپ ہے اور اسی کا یہ نتیجہ تھا کہ مغرب سے مشرق تک ان کی شان وعظمت کا نشان بلند ہوا اور اس قلیل التعداد جماعت کے ہاتھ سے بڑے بڑے کارہائے نمایاں ہوئے اور ہر گوشہ عالم میں

اسلام کا ڈنکا بج گیا۔

تیرہ سو برس کے بعد اسی اتحاد کی ہدایت حبیب رب العزت کے مظہر اتم نے اپنے غلاموں کو کی اور سمجھا دیا کہ اخوان ملت کی باہمی محبت فی الحقیقت پیشوا کی محبت ہے کیونکہ بیٹا اور مرید اپنے باپ اور پیر کی حقیقی یادگار ہے اور یہ ایسا صحیح معیار فرما دیا کہ جس میں کبھی اختلاف ہو نہیں سکتا۔ اسلئے کہ اگر اسلاف سے تعشق ہے تو ان کی نسبت کا اقتضا ہے کہ اخلاف سے ضرور تعلق ہو۔ بقول

زخم دل کیوں عزیز ہو نہ مجھے
یہ نشانی ہے اس کے پیکان کی

غرض فیضان وارثی نے خدا بخش شاہ کی صورت میں قاضی صاحب کی یہ ہدایت ایسی فرمائی کہ موصوف نے صرف بیعت پر اکتفا نہیں کیا بلکہ موضع گدیہ کی قدیم سکونت ہمیشہ کیلئے ترک کی۔ شب و روز خدمت بابرکت میں حاضر رہنے لگے حتی کہ مکان بھی دیوی شریف میں بنالیا اور دربار وارثی کے مخصوص خدام میں انکا بھی شمار ہو گیا لہٰذا یہ تصرف گو بظاہر خدا بخش شاہ صاحب کا تصرف معلوم ہوتا ہے مگر نہیں۔ خدا بخش شاہ بمنزلہ نے کے تھے اور نے نواز کوئی خاص قوت تھی جس نے یہ کرشمہ دکھایا۔ بقول حافظ شیراز علیہ الرحمۃ:

در پس آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند
آنچہ استاد ازل گفت ہمان میگویم

﴿آئینے کے پیچھے طوطی صفت پرندہ رکھا ہوا ہے جو کچھ ازل کا استاد کہتا ہے وہی کچھ یہ بھی کہتا ہے۔﴾

اور بعض مسترشدین کو حقائق و معارف کی تلقین حضور نے دوسری شان سے فرمائی کہ بغیر توسل انکا اطمینان یوں کر دیا کہ ایک معمولی نظم کے مطالعہ سے وہ غلام کامیاب اور فائز المرام ہو گئے۔ ہر چند اس تحریر منظوم کا ظاہری مفہوم غیر معمولی نہ تھا۔ مگر باطنی طور پر اس کا تصرف کچھ اور ہوا۔ چنانچہ احد شاہ صاحب وارثی جو آبائی شرف غلامی سے مشرف اور قدیم تہبند پوش ہیں ان کو سرکار عالم پناہ نے ایک مثنوی مرحمت فرمائی اور ارشاد ہوا کہ روز پڑھ لیا کرو۔ احد شاہ صاحب نے کچھ عرصہ تک اس کی مزاولت کی جس کا اثر یہ ہوا کہ ان کی حالت بالکل متغیر ہو گئی۔ گو ان کے واردات قلبی سے خبردار نہیں ہوں۔ مگر بظاہر یہ کیفیت ان کی تھی کہ نہ عافیت کی خواہش نہ اذیت کا ملال۔ خویش و اقرباء سے بیزار۔ بجز پیشوائے برحق کسی سے سروکار نہ رہا اور بقول

بلبل شیراز یہ خیال پختہ ہوگیا:

جز آستان توام در جہان پناہے نیست
سر مرا بجز این در حوالہ گاہے نیست

﴿آپ کے آستانہ کے سوا دنیا میں میری کوئی پناہ گاہ نہیں اور میرا حوالہ اس کے سوا اور کچھ نہیں﴾

اکثر عوارض جسمانی لاحق ہوئے اور ان کی جہت سے نا قابل برداشت تکلیف بھی اٹھائی لیکن نہ کبھی علاج کیا اور نہ کبھی شکایت سے لب آشنا ہوئے۔ جملہ احوال میں رضائے مولا از ہمہ اولیٰ پر عمل رہا اور آج تک اسی اصول کے پابند ہیں بقول:

سپردم بتو مایۂ خویش را
تو دانی حساب کم و بیش را

﴿میں نے اپنی جمع پونجی تیرے حوالے کردی ہے اور کم یا زیادہ کا حساب تو ہی جانتا ہے۔﴾

علی ہذا حافظ خدا بخش صاحب متوطن آگرہ کو بھی فیضان وارثی نے اسی شان سے مستفیض فرمایا۔ ہر چند حافظ صاحب قدیم حلقہ بگوش تھے اوائل عمر میں ان کے والدین نے مرید کرادیا تھا۔ اسی لحاظ سے وہ اکثر حاضر خدمت بھی ہوتے تھے لیکن بحر علوم ظاہری کے قلندرانہ طریق کی جانب موصوف کی طبیعت کا میلان مطلق نہ تھا۔ ایک مرتبہ جو شوق زیارت میں حاضر ہوئے تو حضور اقدس نے ایک مسدس سنایا جس میں جذبات عشق کا تذکرہ تھا۔

حافظ صاحب کو حضرت اقدس کی اس عنایت کا احساس بھی نہ ہوا۔ بلکہ خیال کیا کہ بجائے آیات واحادیث کے یہ اردو کا مسدس کیوں سنایا گیا۔ دوسرے روز جب حضور نے رخصت کیا تو وہی مسدس مرحمت فرمایا اور بکمال شفقت ارشاد ہوا: ''حافظ جی کبھی کبھی اس کو بھی پڑھ لیا کرو۔''

حافظ صاحب کا بیان ہے کہ آگرہ پہنچ کر دو چار ہی مرتبہ اس کو پڑھا تھا کہ بجنسہٖ وہی واقعات جن کے اشارات اس میں منظوم تھے پیش آئے اور دفعتاً خیالات میں ایسا تغیر ہوا کہ جو سامان میری دلچسپی کا تھا اس سے قطعی نفرت ہوگئی اور وہ احباب جن کی صحبت سے دلبستگی اور فرحت ہوتی تھی ان کی صورت سے وحشت ہونے لگی۔ اور اس حالت میں روز افزوں ترقی ہوئی۔ چنانچہ ایک ہفتہ کے بعد دیوانہ وار حاضر خدمت ہو کر تہبند کا طلبگار ہوا لیکن حضور نے فرمایا کہ۔ ''اپنا تقویٰ نہ خراب کرو''۔

دوسرے روز حافظ صاحب زہد واتقاء سے بیزار ہوکر ننگ وناموس سے دست

بردار ہوئے۔ عاشقانہ روش اختیار کی اور ملامت خلق برداشت کرنے کیلئے تیار ہو گئے۔ ہر چند بعض اہل عقل وہوش نے سمجھایا بھی۔ مگر وہ جوش فرو نہ ہوا اور ایک آہ سرد بھر کر اضطراری حالت میں کہا کہ آپ میرے غمخوار ضرور ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے بقول حافظ شیراز رحمۃ علیہ:

حافظ بخود نہ پوشید این خرقہ مے آلود

اے شیخ پاک دامن معذور دار مارا

﴿حافظ نے یہ شراب کے داغوں سے پر لبادہ خود نہیں پہنا اے شیخ پاک دامن اس حوالے سے مجھے معذور جان﴾

اور اسی رندانہ طریق اور قلندرانہ وضع سے خدمت بابرکت میں حاضر ہوئے ان کی یہ ہیئت کذائی دیکھ کر حضرت مسکرائے اور اسی وقت خرقہ فقر یعنی تہبند مرحمت ہوا اور احمد شاہ نام رکھا اور ارشاد ہوا: ''حافظ جی اب اسی وضع سے رہنا اور اسی وضع سے مرنا۔''

اب اگر خیال کیا جائے وہ مثنوی ایسے حقائق ومعارف سے مملو تھی جس کے ورد سے احمد شاہ صاحب فائز المرام ہوئے اور یہ مسدس سراپا رموز واسرار سے معمور تھا جس کے مطالعہ سے فوری اثر یہ ہوا کہ حافظ احمد شاہ صاحب ایسے عاب دیرینہ کو بیخود وبیقرار کر دیا تو کہا یہی جائے گا کہ ہرگز نہیں اسلئے کہ ان منظوم تحریروں میں گو خصوصیات عشق اور اثرات محبت کا ذکر ضرور ہے مگر متعدد حضرات نے انکا مطالعہ کیا ہے۔ لیکن بظاہر یہی دو شخص چونکہ کامیاب ہوئے ہیں۔ اس واسطے صاف ظاہر ہے کہ یہ کرشمہ کسی خاص قوت کاملہ کا ہے جس نے اس پردہ میں اپنے غلاموں کو دیدویافت کی آنکھیں مرحمت فرمائیں اور برسوں کی ریاضت شاقہ کے بعد بھی جو صورت وہم وخیال میں آنا دشوار یا محال تھی۔ اس کا فی الحال ایسا اظہار ہوا کہ جس کو دیکھ کر یہ مدہوش و بیقرار اور تعلقات عالم سے قطعاً دست بردار ہو گئے۔

چنانچہ اسی قبیل کے متعدد واقعات ہیں کہ مختلف طریق سے اپنے غلاموں کی سرکار عالم پناہ نے پرورش فرمائی ہے اور وہ نعمت تفویض ہوئی جو ان کی حیثیت واستعداد سے بہت زیادہ تھی اور اس کا بھی یقین ہے کہ جو ارادتمند بظاہر فیضان باطنی سے ہنوز مستفیض نہیں ہوئے ہیں۔ وہ بھی بمصداق۔ ''کُلُّ اَمْرٍ مُّرْهُوْنٌ'' بِاَوْ فَاتِهَا ''عنایت پیشوا سے محروم نہیں رہیں گے کیونکہ حضور نے متواتر فرمایا ہے کہ ''جسکی قسمت کا جو حصہ ہے وہ اس کو ملے گا اور اگر زندگی میں نہیں ملا تو مرتے وقت ضرور ملے گا اور مرتے وقت نہ ملا تو اسکی قبر میں ضرور ٹھونس دیا جائے گا۔ اور یہ بھی ارشاد ہوا ہے کہ ''عاشق کا مرید بے ایمان نہیں مرتا''۔ لہذا غلامان وارثی کو یہ بشارت

مبارک ہو کہ ہادی کامل نے امداد کا قطعی وعدہ فرمایا ہے اور جب امداد کا وقت آیا تو حسب وعدہ امداد کی۔ یقینی وہ صادق الاقرار آئندہ بھی اپنا وعدہ ضرور ایفا کریگا۔

بلکہ اس عطیات باطنی کے ساتھ حضور نے ظاہری ہدایات سے بھی ہم کو محروم نہیں رکھا جن کی تعمیل سے اہل ظواہر کے دنیوی معاملات درست اور اہل اللہ کی دینی مشکلات آسان ہوسکتی ہیں۔ بقول

بہار گلشن حسنت دل و جان تازہ میدارد
برنگ اصحاب صورت را بہ بو ارباب معنی را

﴿باغ کی ہوا دل وجان کی خوبصورتی کو تازہ کردیتی ہے جس طرح اصحاب صورت ارباب معانی کے نمائندہ ہوتے ہیں۔﴾

ہر چند حضور کے بعض ملفوظات کا ذکر اخوان ملت نے اپنی تالیفات میں کیا ہے اور وہی ہماری ہدایت کے واسطے کافی اور بس تھے لیکن مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اپنی حاضری کے زمانہ میں جو ارشادات بگوش خود سنے ہیں اور ہنوز میرے حافظہ میں محفوظ ہیں۔ ان میں سے چند ضروری ہدایات مجملاً نقل کروں۔

چنانچہ حضور نے فرمایا کہ:

☆فقیر کو چاہئے ہر حال میں خوش رہے اور زندگی کے دن کاٹ دے۔ تکلیف ہو تو شکایت نہ کرے اور آرام ہو تو شکر بجالائے۔

☆اور یہ بھی ارشاد ہوا ہے کہ فقیر کو چاہئے نہ تکلیف سے گھبرائے اور نہ شکایت کرے۔ کیونکہ محبوب کی دی ہوئی چیز سے گھبرانا محبت کے منافی ہے اور محبوب کی شکایت مشرب عشاق میں کفر ہے۔

☆اور یہ تو سرکار عالم پناہ نے متواتر فرمایا ہے کہ بڑی فقیری یہ ہے کہ مرجائے مگر کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلائے۔ ☆اور یہ بھی ارشاد ہوا ہے کہ فقیر کو چاہیے کسی کی چیز کو خیانت کی نگاہ سے نہ دیکھے۔

☆فقیر وہ ہے جو اکنگ رہے۔

☆فقیر وہ ہے جو اپنی بستی میں رہ کر خویش واقربا کا ممنون نہ ہو۔

☆فقیر کو لازم ہے کہ بجز خدا کے کسی کا بھروسہ نہ کرے۔

☆فقیر جہاں رہے لاطمع رہے۔

☆بڑی بات یہ ہے کہ فقیر اپنی بستی میں نیک نام ہو۔
☆مقام فقر بہت بڑا مقام ہے۔
☆سلسلہ فقر اہلبیت کرام علیہم السلام سے ہے۔
☆فقیری بی بی فاطمہؑ سے ہے اور امام حسین علیہ السلام کے ذریعہ سے یہ فیض جاری ہوا۔
☆فقیر وہ ہے جو انتظام سے علیحدہ ہو۔
☆فقیر وہ ہے جس کے پاس کچھ نہ ہو۔
☆فقیر وہ ہے جو کسی چیز کا نہ مالک ہو نہ خود کسی کی ملک میں ہو۔
☆فقیر کو چاہیے نہ کسی کیلئے دعا کرے اور نہ گنڈا تعویذ کرے۔
☆فقیر وہ ہے جس کی کوئی سانس خالی نہ جائے۔
☆یہ بھی تاکید فرمایا ہے کہ فقیر کو لازم ہے کہ دینا کے واسطے کوئی کام نہ کرے اور خدا کے واسطے جان دیدے۔
☆جو شخص اپنا کام آپ کرنا چاہتا ہے تو اللہ میاں بھی علیحدہ ہو جاتے ہیں اور جو اللہ کے بھروسہ پر چھوڑتا ہے تو اللہ اس کے کام کو پورا کرتا ہے بس لازم یہ ہے کہ جو کام کرے اللہ کے بھروسہ پر کرے۔
☆یقین کے ساتھ خدا کو اپنا مددگار جانو۔ وکفی باللہ وکیلا۔
☆خدا ہر چیز کا مالک اور ہر چیز پر قادر ہے۔
☆خیر و شر اسی کی جانب سے ہے۔ مگر تصدیق اس کی مشکل ہے۔
☆خدا تم میں ہے مگر تم دیکھ نہیں سکتے (فِیْ اَنْفُسِکُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْن)۔
☆ایمان خدا کی محبت کا نام ہے۔
☆من و تو کا جھگڑا جائے تو خدائی کا جلوہ نظر آئے۔
☆اپنی ہستی کا مٹانا عین فقیری ہے۔
☆یہ بھی فرمایا ہے کہ موحد ہونا بہت مشکل ہے۔
☆آج کل توحید ٹکے سیر ہے۔
☆عشق وہی ہے جو کسب سے نہیں حاصل ہوتا۔
☆محبت ہے تو سب کچھ ہے اور محبت نہیں تو ریاضت بیکار ہے۔
☆محبت ہے تو ہزار کوس پر ہم تمھارے ساتھ ہیں۔
☆ایک صورت کو پکڑ لو وہی تمھارے ساتھ یہاں بھی رہیگی اور وہی قبر میں اور وہی حشر میں

ساتھ ہوگی۔

☆ محبت میں شاہ وگدا کا فرق نہیں رہتا۔ جیسے محمود وایاز کا واقعہ ہے۔

☆ یار کا تصور عاشق کی زندگی ہے۔

☆ رضائے یار عاشق کا ایمان ہے۔

☆ عشق میں انتظام نہیں۔

☆ جس کو اپنی خواہشات کی خبر ہے وہ عشق سے بیخبر ہے اور اسی مضمون کو حضور نے دوسرے لفظوں میں یوں فرمایا ہے کہ عاشق یار سے خبردار اور موجودات سے بیخبر رہتا ہے۔

☆ معشوق کی جفا کو عاشق عطا سمجھتا ہے۔

☆ محبت میں انسان اندھا ہوجاتا ہے۔

☆ ایمان محبت کامل کا نام ہے۔

☆ عشق میں ترک ہی ترک ہے۔

☆ عاشق وہ ہے جو معشوق پر جان قربان کرے۔

☆ عشق میں سر دے تو یہ مہم سر ہو۔

☆ جب تک خود بینی ہے پیر سے حجاب رہے گا۔

☆ خود پرستی حجاب کو بڑھاتی ہے اور مقصود سے دور رکھتی ہے۔

☆ بے خودی حجاب کو اٹھاتی ہے۔

☆ مرید اس طرح پیر سے ملے۔ جس طرح قطرہ دریا سے مل جاتا ہے۔ جب تک قطرہ نہیں ملتا، قطرہ رہتا ہے اور جب مل جاتا ہے تو وہی قطرہ دریا ہو جاتا ہے۔ پھر کوئی اسے قطرہ نہیں کہتا۔

☆ عشق میں کفر اسلام ہو جاتا ہے۔

☆ انسان اسی کے ساتھ رہتا ہے جس سے محبت ہوتی ہے۔

☆ پیر کی صورت میں خدا ملتا ہے اور تمثیل میں مولانا علیہ الرحمۃ کا یہ شعر پڑھا:

چوں کہ ذات پیر را کردی قبول

ہم خدا در ذاتش آمد ہم رسول

﴿میں نے پیر کی ذات کو اس لئے قبول کیا ہے کہ اس کی ذات میں اللہ اور رسول نظر آتے ہیں﴾

☆ جو شخص جس سے محبت کرتا ہے اسی کے ساتھ اس کا حشر ہوتا ہے۔

☆ جوصورت تمھارے ساتھ یہاں رہے گی وہی مرتے وقت، وہی قبر میں، وہی حشر میں ساتھ رہے گی۔

☆ جس کے تصور میں مرو گے اسی کے ساتھ حشر ہوگا۔

☆ جس کو تصدیق نہیں اس کا ایمان نہیں۔

☆ جس صورت کا خیال پختہ ہو جائے گا وہی صورت بعد مرگ بھی قائم رہے گی۔

☆ جو مرید پیر کو دور سمجھے وہ مرید ناقص ہے اور جو پیر مرید سے دور رہے وہ پیر ناقص ہے۔

☆ حاسد ہمیشہ ذلیل رہتا ہے۔

☆ حسد سے ایمان خراب ہوتا ہے۔

☆ کسی کو برا نہ کہو، نہ برا سمجھو۔

☆ کسی کی عداوت کو دل میں جگہ نہ دو۔

☆ دشمن سے بدلہ نہ لو۔

☆ دشمن کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔ یہ حضرت شیر خدا کی سنت ہے۔

☆ جس دل کو محبت سے سروکار ہوتا ہے اس میں عداوت کی گنجائش نہیں ہوتی۔

☆ ہماری منزل عشق ہے اور منزل عشق میں خلافت اور جانشینی نہیں، جو ہم سے محبت کرے وہ ہمارا ہے۔ (بلکہ مستند ذرائع سے معلوم ہوا ہے اور رسالہ عین الیقین میں بھی لکھا ہوا ہے کہ ۲۷ نومبر ۱۸۸۹ء کو یہ فرمان بایں صراحت ضبط تحریر میں آیا کہ) ہماری منزل عشق ہے جو کوئی دعوی جانشینی کا کرے وہ باطل ہے ہمارے یہاں کوئی چمار ہو یا خاکروب ہو جو ہم سے محبت کرے۔ وہ ہمارا ہے۔"

الغرض پیشوائے برحق نے ہماری ہدایت ایسے جامع اور عام فہم الفاظ میں فرمائی ہے جو سر بسر خوبیوں سے مملو ہے۔ مثلاً اگر نظر غائر سے دیکھا جائے تو انہیں احکام میں تخصیص بھی پائی جاتی ہے اور انہیں میں تعمیم بھی معلوم ہوتی ہے۔ جس طرح ایک مجرد اور آزاد غلام انہیں احکام کی تعمیل سے کامیاب اور فائز المرام ہو سکتا ہے اسی طرح ایک ایسا دست گرفتہ جو ہنوز دام تعلقات میں گرفتار ہے وہ بھی انھیں زرین ہدایات سے استفاضہ حاصل کر سکتا ہے۔ اسلئے بآواز بلند ہم کہہ سکتے ہیں کہ حضور کے ارشادات ہمارے دینی مفاد اور دنیوی بہبود کے واسطے کافی اور بس ہیں اور ملفوظات وارثی کا مجموعہ جملہ غلامان وارثی کیلئے مکمل دستور العمل کا حکم رکھتا ہے۔ جس کی تعمیل سے ہم انسان بلکہ انسان کامل ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ وہ اخوان ملت جنہوں نے صدق

وخلوص سے حضور کی تعلیم کوکلیۃً تسلیم کیا ہے وہ مقصود اصلی کے حاصل کرنے میں ضرور کامیاب ہوئے اور درحقیقت وہی اس کے مستحق ہیں کہ ان کو یہ مقدس خطاب دیا جائے اور ان کو وارثؐ کہا جائے۔

مالک حقیقی ہم کو بھی یہ توفیق مرحمت فرمائے کہ فرمانبردار غلاموں کی طرح ہم بھی احکام وارثؐ کی بہ کمال ذوق وشوق تعمیل کریں اور ہمارے خیال کو بھی ایسی یکسوئی اور وہ استقلال حاصل ہو کہ حوادث محسوسات عالم سے ہم متاثر نہ ہوں اور مطلوب حقیقی کے شوق وصال میں زبان حال سے کہیں:

جان من زندہ بتاثیر ہوائے دگر است
سازداری نہ کند آب و ہائے دگرم

﴿میری جان کسی دوسری ہوا کے اثر سے قائم ہے۔کوئی اور ہوا اور پانی میرے موافق نہیں﴾

لہٰذا اب یہ رسالہ اس عذر کے ساتھ ختم کرتا ہوں کہ جب یہ مسلمہ ہے کہ شہنشاہ اقلیم عشق سرکار عالم پناہ کے تصرفات وہدایات بھی یقینی جذبات عشق اور خصوصیات محبت سے خالی نہیں تو عشق کے رموز واسرار کا مجملاً ذکر کرنا بھی دشوار ہے۔ بقول:

سخن عشق نہ آنست کہ آید بزبان
ساقیا می دہ وکوتاہ کن این گفت وشنید

﴿عشق کی بات کبھی زبان پر نہیں آسکتی ساقیا مجھے جام تھمادے تاکہ میں اس بات چیت کو مختصر کردوں﴾

تم بعونہ تعالیٰ وھوینولی الصالحین

بپایان آمداین دفتر حکایت ہمچنان باقی
بصددفتر نشاید گفت حسب الحال مشتاقی

﴿یہ کتاب مکمل ہوگئی لیکن ابھی اس کی بات باقی ہے شاید اس کی بات کیلئے سو کتابیں بھی ناکافی ہوں گی۔﴾

تقریظ و تاریخ

از نتائج طبع عالی سخن سنج بیمثال جامع فضل کمال فصیح طلیق اللسان منطیق بلیغ البیان فروغ مطلع معنی شناسی

جناب حکیم مولوی سید احمد صاحب وارثی مدظلہٗ العالی

بگوش آید ز ہر سویم ہوالوارث ہوالوارث
ازین رو فاش میگویم ہوالوارث ہوالوارث

الحمدللہ الذی من علینا بوجود محمدن المصطفٰے ﷺ پس آنکہ درین روز ہا در محترم حضرت اوگھٹ شاہ وارثی پھر ایونی کہ تصانیف دیگر ہم دارو رسالہ مفیدہ وخبیرہ رشحات الانس درباب چگونگی مرور اوقات خویشتن منضبط فرمودہ کہ دران از یوم ادراک شرف خدمت حضور مرشد پاک فرزند صاحب لولاک قطب عالم غوث اعظم حاجی حرمین الشریفین وسلطنیانی الدارین سیدنا ومولینا وارث علی شاہ رحمۃ اللہ علیہ تا خفائے زندگانی ظاہری وظہور حیوۃ باطنی حضور لامع النور رطاب ثراہ وجعل جنۃ الرضوان شواہ ہر چہ دیدو گذشت بطریق اختصاری کے از ہزار ثبت نمودہ تا از سر گذشتش یادگارے و پس آیندگان را ازوے تذکارے باشد۔ ہمدرین نورو دامان اوراق آخر نیش تبرکاً تیمناً بابند ے از گرانمایہ گوہائے ملفوظات ہمایوں کہ گاہ بیگاہ دران ہنگام بگوش ہوشش خوردہ بود پر اپنا شتہ وبرائے خویشتن بہینہ زادے برداشتہ ۔چشم آن دارم کہ اگر میسر شود دیگر برادران طریقت ہم تمبا بنقش گام بردارند ذخیرہ خوبی وگلدستہ مرغوبی ازین دست فراہم متوان شد۔ قطعہ مختصرے از سال طبعش کہ تعجلت تمام بہم رسید الحال بنوک خامہ سپردہ میشود۔ والسلام خیر ختام۔

چو اوگھٹ شاہ احوالش رقم کرد
اگرچہ بیشتر حال خودش ہست
بفیض وارثِ پاک من احمد
بنجے زدم از تاریخ وارثت
نمی سنجم کم ، از تاریخ وارث
بشد سالش ہم ، از تاریخ وارث

1926ء